انقلابِ ایران

بیسویں صدی میں تحریکِ مشروطیت (آزادی)

مؤلفہ

نظر حسنین زیدی ایم۔اے

لیکچرر گورنمنٹ کالج
سکھر

سالِ اشاعت ۶۶ء

اشاعت	ایک ہزار
کتابت	محمد ایوب۔ سکھر
طباعت	اتحاد پریس سکھر

طابع و ناشر

محمد مسعود الحسنین (مسعود اکادمی) ڈی ۲۳/۲ ناظم آباد
مسعود منزل

قیمت :- دو روپے پچاس پیسے

ج

انتساب

لائقِ صد احترام استاذی المحترم پروفیسر ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب مدظلہ،
ایم اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ)

صدر شعبۂ فارسی دانش گاہ کراچی کے نام
جن کے قدموں کی خاک میرے لئے سرمۂ بینش ہے۔

؎ آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

منظر حسنین زیدی

★

نام ———— سید منظر حسنین زیدی

پیدائش ———— اپریل ۱۹۲۳ء

وطن ———— برست نزد پانی پت کرنال۔

تعلیم ———— ایم اے (اردو) چانسلر میڈل سندھ یونیورسٹی

۔ ایم اے (فارسی) کراچی یونیورسٹی

مولوی فاضل، منشی فاضل،

ادیب فاضل۔ پنجاب یونیورسٹی۔

مشاغل ———— درس و تدریس۔ تصنیف و تالیف

لیکچرر گورنمنٹ کالج، سکھر

تالیفات ———— (۱) غالب تاریخ کے آئینے میں۔ (مطبوعہ)

(۲) اقبال ضربِ کلیم کی روشنی میں (زیرِ طبع)

(۳) خطوط جلال الدین حیدر "

فہرست مندرجات

نمبر شمار	موضوع	صفحہ
	حصّہ اوّل	
	آزادی	
باب اوّل	آزادی اور اسکا مفہوم	۱
باب دوم	تحریکِ آزادیٔ ایران	۸
باب سوم	دستوری آزادی اور اس کا مفہوم	۱۳
باب چہارم	انقلاب مشروطیت ایران	۱۸
	حصّہ دوم	
	مخصوص شہدار کے تذکرے	
باب پنجم	حاجی میرزا نصراللہ ملک المتکلمین اصفہانی	۶۴
باب ششم	میرزا جہانگیر خان شیرازی مدیر روزنامہ صورِ اسرافیل	۱۰۹
باب ہفتم	سیّد جمال الدین واعظ اصفہانی	۱۲۱
باب ہشتم	خونِ شہدار کا اثر (محمد علی کی حکومت کا خاتمہ)	۱۳۹
باب نہم	خاندانِ پہلوی کا آغاز۔ رضا شاہ کبیر	۱۶۵
باب دہم	محمد رضا شاہ پہلوی	۱۷۷
خاتمہ		
منابع		۱۹۱

پیش لفظ

ملک ایران اپنی پرانی تاریخ، تہذیب اور عملی سرگرمیوں کے پیشِ نظر اپنی اہمیت کا حامل ہے۔ اس امر کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ برِ صغیر پاک و ہند اور ایران کے درمیان کس قدر تاریخی اور تہذیبی مواصلت اور روحانی یگانگت ہے۔ بیسویں صدی کا آغاز کم و بیش تمام عالمِ مشرق کے لئے انتہا ظلم کا زمانہ تھا۔ ملّتِ ایران کو خصوصی طور پر آئینی آزادی کے لئے بے انتہا تکلیفیں اٹھانی پڑیں، غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں نے ایسا محسوس کیا تھا کہ وہ ظلم و ستم ایرانیوں پر نہیں بلکہ ان پر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے دلی جذبات، روحانی و ملی تعلق کا اظہار کھلم کھلا طور پر نہ کر سکے۔ جس کا سبب مغرب کی وہ قیدِ غلامی تھی جس نے ایرانیوں کا گلا بھی گھونٹ رکھا تھا۔ بلاشبہ برِ صغیر پاک و ہند کے مسلمان ایک غیر ملکی تشدد کے تحت آزادیٔ گفتار اور آزادیٔ عمل سے ہمکنار نہ تھے، لیکن پھر بھی وہ اپنے دورِ غلامی میں اپنی آزادی کے لئے بار بار ایران و افغانستان کی طرف نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے۔ جس کی تصدیق انیسویں صدی کے اخبارات کر سکتے ہیں۔ آج اس برِ صغیر کے مسلمان ایک آزاد دولتِ پاکستان کے شہری ہونے کے سبب اپنی سابقہ اور دیرینہ تہذیب و مذہب کے باہمی رشتوں کی نئے سرے سے تجدید کر رہے ہیں۔ درحقیقت موجودہ دور میں معاہدہ "استنبول"

کے سحت پاکستان، ایران اور ترکی کا ایک دوسرے کے قریب تر آنا ان ہی باہمی اقدار کی نشان دہی کرتا ہے۔ پھر پاکستان اور ایران کے درمیان باہمی یکسانیت یہ بھی رہی ہے کہ دونوں ملکوں کے جان فروش حب الوطنوں نے غیر ملکی اثرات اور دخل اندازیوں کا بے مثال طریقے پر مقابلہ کیا اور اپنے وطنوں کی آزادی کی خاطر بے دریغ مالی وجانی قربانیاں دی ہیں۔ جو دونوں ملکوں کی تاریخ کے نمایاں اور سنہری باب ہیں۔

جناب نیئر حسنین زیدی صاحب جنہیں اپنے مضمون پر عبور حاصل ہے اور جنہیں فارسی زبان اور ایرانی تہذیب و تاریخ سے خاص لگاؤ اور انہماک رہا ہے۔ انہوں نے موجودہ کتاب " انقلابِ ایران" اپنے وسیع مطالعہ اور جانفشانی سے تالیف کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے ایران و پاکستان کے درمیان ثقافتی ایکا پیدا کرنے، اور دراصل موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت کو ایک طریقہ پر پورا کرنے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ اردو زبان میں اس کتاب کی اشاعت سے پاکستان کے مسلمان بالخصوص اور ہندوستان و دیگر ممالک کے مسلمان بالعموم ایران کی تاریخ اور آزادی کی راہ میں ایرانیوں کی مستقل جدوجہد وایثار کا مطالعہ کر سکیں گے۔

امید ہے کہ زیدی صاحب کی یہ کتاب حلقۂ اہلِ ذوق میں نمایاں مقبولیت حاصل کرے گی۔

ڈاکٹر محمد عمر
پی، ایچ، ڈی
(ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس)

گورنمنٹ کالج (پوسٹ گریجویٹ سنٹر)
سکھر
۲۷ نومبر ۱۹۶۵ء

حرفِ آغاز

ایران صدیوں سے اپنی سرفروشانہ کوششوں اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے سبب تاریخ مشرق میں خصوصاً ایک اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اس سرزمین کے نامور بادشاہوں اور دانشوروں نے دنیا میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ اہلِ دانش سے مخفی نہیں۔ برصغیر پاک و ہند پر ایران کے اثرات براہِ راست پڑتے رہے ہیں۔ اور اس سرزمین کو ایران کے نامور علماء، ادباء، شعراء اور فضلاء نے اپنی علمی سرگرمیوں سے ہمیشہ نوازا ہے۔ اسی لیے برصغیر پاک و ہند کے ساتھ ایران کے ثقافتی، علمی، سیاسی تعلقات ہمیشہ سے اچھے رہے ہیں۔ اردو زبان پر تو ایران کا عظیم احسان ہے۔ مذہب کا بیشتر سرمایہ فارسی سے اردو میں منتقل ہوا۔ اس طرح ایران اپنے علمی ذخیرہ کو پاک و ہند کی گود میں منتقل کرتا رہا۔

ہزاروں، لاکھوں نامور صاحبانِ علم ایران سے آکر اس سرزمین کو اپنے

علمی فیوض سے نوازتے رہے، اُن کے ان احسانات کے سبب ہماری گردنیں خم ہیں۔

اسی لئے ایران سے وابستگی ہماری تاریخ کا ایک باب ہے۔ ایرانی قوم کی بہبود و بہتری میں ہماری دعائیں ہمیشہ شاملِ حال رہی ہیں۔ اسی لئے مفکرِ اسلام ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمۃ تہران کو مرکز عالم اسلامی بنانے کے لئے ہمیشہ دست بدعا رہے۔

ایران بیسویں صدی میں جس پُر آشوب دور سے گذرا ہے اور جو تحریکیں وہاں اٹھتی رہیں، اُس نے پورے ایران کو متاثر کیا ہے۔ اغیار نے جس طرح اس سرزمین پر غاصبانہ قبضہ کئے رکھا اس نے ایران کی ترقی کو عملاً روک دیا تھا۔ اسی لئے وہاں ایسے باہمت افراد پیدا ہوئے جنہوں نے ایران کی آزادی کے قیام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور بالآخر اپنے ملک کو غیروں کے خونیں چنگل سے آزاد کرا کے دم لیا۔ یہ مقالہ اسی تاریخ کی ایک کڑی ہے۔

اسی لئے اس موضوع کا تعلق "انقلاب مشروطیت ایران" سے ہے یہ انقلاب پچھلی صدی کے رُبع آخر میں شروع ہوا۔ جس کا مقصد ایران میں ہزاروں سال کے دورِ استبداد کا اختتام اور مملکتِ ایران میں پارلیمانی حکومت کا قیام تھا۔

اس سلسلہ میں ایران کی آزادی کے علمبرداروں نے انقلابِ مشروطیت کے دوران میں جو جو تکلیفیں اٹھائیں اُسکا نقشہ ہم نے مختصر طور پر بطور پس منظر

کے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے آزادی اور دستوری آزادی کے حقیقی مفہوم پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اسی سلسلہ میں ایرانی قوم میں آزادی کی تحریک کا تاریخی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

انقلاب مشروطیت کے دوران میں جن لوگوں نے سب سے بڑھ کر حصہ لیا، اور اپنی جان اور اپنے مال کی قربانیوں سے اس انقلاب کو تکمیل کے درجہ تک پہنچایا اُن کے کارنامے تاریخ انقلابِ ایران کے صفحات پر زرّیں حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

ان میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو خال خال اب بھی زندہ ہیں اور جنہوں نے ایران میں آزادی کا ثمرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان لوگوں میں خاص طور پر جناب آقائے حسن تقی زادہ کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے گذشتہ پچپن ۵۵ سال میں ایران کی سیاسی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور حصولِ آزادی کے بعد اپنی قوم کو پروان چڑھتے دیکھا ہے۔ ان لوگوں میں ایسے اشخاص بھی تھے جو شمعِ آزادی پر پروانہ وار نثار ہو گئے۔ ان اشخاص کی زندگیاں خصوصی مطالعہ کی مستحق ہیں، اور ہم نے اسی مقصد سے اس موضوع کو اپنے مقالہ کے لئے منتخب کیا ہے۔ یہ مقالہ ادھورا رہ جاتا اگر اس سلسلے میں دودمان پہلوی کا تذکرہ ان صفحات میں نہ کیا جاتا۔ دودمانِ پہلوی ہی نے نئے طرزِ فکر سے ایران کو جدید مہذب اقوام کی ممتاز صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اور اس طرح عہدِ جدید کا ایک خاکہ پوری طرح نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

ایران میں عہدِ جدید میں اس موضوع پر بہت سی محققانہ اور ضخیم کتابیں

وجود میں آئی ہیں، جن سے اس مقالہ کی تیاری میں ہم نے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض ایسی کتابیں تھیں، جو حال ہی میں ایران میں وجود میں آئیں، اور ان میں خاص طور پر "تاریخ انقلاب مشروطیت ایران" ہے جو سات جلدوں پر مشتمل ہے اور جو آزادی کے سب سے بڑے ہیرو ملک المتکلمین کے لائق فرزند ڈاکٹر مہدی مرحوم ملک زادہ سابق پروفیسر طہران یونیورسٹی کی برسوں کی محنت اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ ملک زادہ کی یہ کتاب اس موضوع پر بہترین خیال کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض ایسی کتابیں ہیں، جن کا مطالعہ اس مقالہ کے دوران میں لازمی تھا اور جن کا پاکستان میں دستیاب ہونا محال تھا۔

چنانچہ اس سلسلہ میں ہم نے سفارت خانۂ ایران، کراچی کے اراکین سے امداد چاہی۔ اور ہماری اس درخواست کے نتیجہ میں سفارت خانۂ ایران نے شعبۂ فارسی کراچی یونیورسٹی کی جو امداد کی ہے وہ خاص ہمارے شکریہ کی مستحق ہے۔ اس لئے کہ اگر ان کی خاص امداد ہمارے شاملِ حال نہ ہوتی، تو ہمارا یہ مقالہ موجودہ صورت میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔

جس دقّتِ نظر سے ہم نے اس موضوع پر متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور جس مرتّب اور منظم طریقہ سے ہم نے ضروری واقعات کو پیش کیا ہے، اس پر ہمارا مقالہ شاہد ہے، اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اس موضوع پر اس طرح کا کوئی مقالہ اردو میں ہی نہیں بلکہ فارسی میں بھی وجود میں نہیں آیا۔ تو ہمارا یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا۔

ناسپاس گزاری ہوگی اگر سفارت کبریٰ ایران کے پریس اٹاشی آقائے ڈاکٹر زرنگار کا بھی شکریہ نہ ادا کیا جائے۔ موصوف نے جدید دور کے متعلق بعض قیمتی مواد فراہم فرمائے۔ موصوف کے اس تعاون سے اس کتاب کی آخری کڑی مکمل ہو سکی ہے۔ میں ان کے اخلاقِ کریمہ کا بہت ممنون ہوں۔

اِس مقالہ کی تیاری کے ضمن میں ہمارے استادوں خصوصاً جناب پروفیسر ڈاکٹر غلام سرور صاحب صدر شعبۂ فارسی کراچی یونیورسٹی، ڈاکٹر مطیع الامام صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی شعبۂ فارسی، ڈاکٹر عابد علی خان صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی شعبۂ فارسی نے جو ہماری امداد کی ہے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر ان کی رہنمائی اور شبانہ روز کی کوشش ہمارے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ مقالہ اس قدر مکمل صورت میں وجود میں نہ آتا۔ جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب گورنمنٹ کالج سکھر نے کتاب پر نظرِ ثانی فرمائی اور قیمتی مشورے بھی دیئے ہمیں اُمید ہے کہ ان کی رہنمائی آئندہ بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ ہم صدقِ دل سے ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں اور خداوند تعالیٰ سے ان کی سلامتی کی دعا مانگتے ہیں۔

اربابِ علم سے توقع ہے کہ وہ اپنے مفید مشوروں سے آگاہ فرمائیں گے تاکہ اس کتاب کی خامیاں دور کی جاسکیں اور یہ کتاب صحیح معنوں میں مفید ثابت ہو سکے۔ ؏ بر کریماں کارہا دشوار نیست۔

کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں عزیزی رحمت اللہ قریشی ایم، اے

خاص طور پر دعاؤں کے مستحق ہیں جنہوں نے کتابت سے لے کر طباعت تک
کی تمام منزلوں کو اپنے قیمتی وقت سے سر کیا۔

بہر حال اپنی کوتاہیوں کے اعتراف کے ساتھ اربابِ فہم و نظر کی مشفقانہ
رہنمائی کا محتاج ہوں۔

سکھر
۲۵؍ دسمبر ۶۵ء

نظیر حسنین زیدی
گورنمنٹ کالج سکھر

انقلابِ ایران

بیسویں صدی میں

ع

اعلیٰ حضرت شہنشاہِ ایران کی عکسی تصویر عزیزی محمد افضال
متعلم بی اے گورنمنٹ کالج سکھر کی کوششوں کا مرہونِ منت
ہے۔ جس کے لئے ہم از حد شکر گزار ہیں۔

نیّر حسنین زیدی


afzal

حصّہ اوّل

باب اوّل

آزادی اور اس کا مفہوم

آزادی کا قدیم ترین مفہوم یہ ہے کہ فرد اپنی جان اور مال کے تحفظ میں آزاد ہو اور اس کو دوسرے فرد کی طرف سے یہ اندیشہ نہ ہو کہ قوی ہونے کی صورت میں وہ اس کی جان و مال پر حملہ آور ہوگا اور وہ اُس کو اُن دونوں چیزوں سے محروم کر دے گا۔ اس لئے اگر اس کو اپنی جان و مال کے تحفظ کے قائم نہ رہنے کا اندیشہ لگا ہوا ہو، اور اس کا ذہن ان ہی دونوں چیزوں کے تحفّظ میں مشغول ہے تو حقیقت میں وہ آزادی کے ثمرہ سے بے بہرہ ہوگا۔

جب افراد جماعت میں بدل جاتے ہیں تو بھی آزادی کے حقیقی مفہوم میں فرق نہیں پڑتا۔ پہلے فرد اپنی جان اور مال کے تحفظ کے لئے آزادی کا خواہش مند تھا۔ اب جماعت جو افراد پر مشتمل ہے اپنے وجود اور اموال کے تحفظ کی خواہاں ہے۔

پہلے اگر فرد ضعیف ہونے کی صورت میں قوی سے حملہ کا اندیشہ رکھتا تھا، تو دوسری صورت میں جماعت اپنے وسائل کی کمی کی وجہ سے دوسری جماعت کے حملہ کی وجہ سے اندیشہ ناک ہے اور یہی وہ اندیشہ ہے جو اس کو (جماعت کو) آزادی

کے صحیح مفہوم سے بے بہرہ کردیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ آزادی کے فوائد سے بہرہ مند ہو اسی طرح ایک جماعت بھی یہ حق رکھتی ہے کہ وہ بھی آزادی کی برکتوں سے مستفید ہو۔

جب انسانی آبادی کو ترقی ہوئی اور تمدن کی بنیاد پڑی تو انسانوں نے اجتماع کی بہبودی اور برقراری کے لئے ایسے قوانین مرتب کئے جن کی پابندی اجتماع پر لازمی قرار پائی۔

اس دور میں آزادی کا مفہوم اپنے سابقہ دور سے کسی قدر بدل گیا۔ اور آزادی کی صورت یہ ہوئی کہ فرد یا جماعت اجتماعی قانون کی پابندی کرکے ہی بہتر زندگی بسر کرسکتا ہے اور اس کی یہی زندگی صحیح آزادی کے مفہوم کی حامل ہے۔

تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ آزادی کا بنیادی مفہوم اگرچہ وہی رہا جو قدیم زمانہ میں پایا جاتا تھا تاہم اقتضائے وقت کی بناء پر آزادی بھی مختلف قسموں میں بٹ گئی۔ جیسے آزادئ تقریر، آزادئ جماعت، آزادئ عقائد اور آزادئ قانون وغیرہ۔

یہ سب اقسام جو انسان کی مختلف تمدنی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وجود میں آئی تھیں ایک متمدن اجتماع کے لئے ضروری تھیں اور اسی اعتبار سے ہر فرد کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ مذکورہ اقسام کی آزادیوں کے فوائد سے بہرہ ور ہو۔

مرورِ ایام کے ساتھ حکومتیں وجود میں آئیں اور حکومتوں کے وجود میں آنے کے بعد انفرادی اور اجتماعی آزادی کا مفہوم اور تبدیل ہو گیا اور آزادی کا وہ بنیادی تصور جو سطورِ بالا میں پیش کیا گیا ہے، محدود ہو گیا۔ اس لئے کہ فرد اور اجتماع اپنی

انفرادی اور اجتماعی مفہوم کو کھو بیٹھا اور یہ خیال وجود میں آیا کہ وہ خود اپنی جان اور مال کے مالک خود نہیں ہیں بلکہ بادشاہ ہے ۔ یہی نہیں بلکہ ان کے ارادوں کا بھی مالک وہی ہے اور وہی حقیقت میں آزاد ہے اور اس کی حکومت میں اس کی ذات کے سوا آزادی کا بنیادی تصور مشکل ہی سے پایا جاتا ہے ۔

اس طرح کے پابند ماحول کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ افراد اور اجتماع اپنی بنیادی آزادی پھر اپنے بادشاہ سے واپس لیں ۔ اس مقصد کے لئے دُنیا کے مختلف حصّوں میں مختلف اوقات میں تحریکیں وجود میں آتی رہیں ۔

چنانچہ جب مختلف اوقات میں مختلف ممالک میں حصول آزادی کے حقوق کے لئے ان تحریکوں نے زور پکڑا اور انقلاب کی صورت اختیار کی تو ایک نئی کشمکش وجود میں آئی جس کو تاریخِ عالم میں "تحریک انقلابِ آزادی" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔

مختلف ممالک میں مختلف اوقات میں آزادی کی مختلف اقسام، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، انقلاب پسندوں کا مطمح نظر رہیں اور یہ شکل سے دیکھا گیا ہے کہ آزادی چاہنے والوں کے پیشِ نظر بیک وقت یہ تمام اقسام ہی موجود ہوں ۔ مثال کے طور پر بعض ممالک میں مذہب کی قیود اتنی شدید تھی کہ ان کے برخلاف انقلاب برپا ہوا اور انقلاب لانے والوں نے مذہبی مراسم کی ادائیگی کے لئے آزادی حاصل کی ۔

چونکہ اس مقالہ کا تعلق سیاسی آزادی سے ہے ۔ اس لئے اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ اس مقام پر صرف ایسی تحریکوں کو پیش کیا جائے جن کا تعلق سیاسی آزادی سے ہو ۔ اور جس کے حصول کے لئے مختلف اوقات میں مختلف ممالک میں

تحریکیں وجود میں آتی رہیں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ جو تحریکیں اس مقصد کے لئے دنیا کے مختلف حصّوں میں وجود میں آئیں وہ صحیح طریقہ سے اپنے انجام کو پہنچیں۔ اور انقلاب پسندوں کے تمام مقاصد حاصل ہو گئے۔

اکثر و بیشتر ان تحریکوں کا نتیجہ ناکامی ہوا۔ اور جہاں کہیں ان کو کامیابی ہوئی وہاں بھی لوگوں کو محدود آزادی نصیب ہوئی۔

تاریخِ عالم میں اس طرح کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ چنانچہ یورپ میں تحریکِ اصلاح (ریفارمیشن) کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ فرد کی آزادی کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ چنانچہ جب تک یہ نظریہ قائم رہا فرد کو آزادی کے حقوق ورثہ میں بھی ملتے رہے اور فرد نے ان حقوق کا اجتماع کے فوائد کا عام خیال رکھتے ہوئے بھی استعمال کیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرد کی آزادی مملکت کی آزادی کے مدِ مقابل آگئی اور اس کا نتیجہ اجتماعی انتشار کی صورت میں نکلا۔

اس ضمن میں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ جو لوگ فرد کی آزادی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے ان کے خیال میں اجتماع کے فائدے کے لئے فرد کی آزادی کو محدود کرنا صحیح نہیں تھا۔ اس لئے وہ حکومت کے ان اقدامات کو آزادی کے خلاف سمجھتے تھے جو وہ اجتماع کے فائدے کے لئے فرد کے حقوق کو محدود کرنے کے لئے کرتی تھی اور یہ سیاسی نظریہ وجود میں آیا کہ حکومت کو محض ایک سرپرست کی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے تاکہ فرد اپنی کوشش اور محنت سے پوری طرح بہرہ مند ہو سکے۔

جب فرد اور حکومت کی یہ کشمکش بڑھ گئی تو دو نظریے وجود میں آئے:-

ایک تو یہ کہ حکومت کے مذکورہ اقدام کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ فرد کی آزادی کو محدود نہ کرے۔

دوسرے یہ کہ لائق ترین فرد کو مملکت کی خدمت کے لئے چنا جائے۔

یہی آخری نظریہ جمہوری حکومت کے وجود میں آنے کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ فرد اور حکومت کے تصادم کی وجہ سے اجتماع میں انتشار پیدا ہو چکا تھا، اس لئے اس انتشار کو دور کرنے کے لئے حکومت نے مجبور ہو کر آزادی میں دخل دیا۔ لیکن دوسری طرف شخصی حکومت نے جمہوری حکومت کے لئے بھی راستہ صاف کر دیا۔

تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ حکومت خواہ شخصی ہو یا جمہوری۔ اجتماع کے لئے ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جس کی پابندی ہر فرد پر لازمی قرار دی جائے۔ اور حقیقی معنوں میں انفرادی یا اجتماعی آزادی وہی ہے جو قانون کے حدود اور دائرہ کے اندر ہو۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صحیح آزادی سے بہرہ مند ہونے کے لئے بھی نوعِ انسانی کو بعض اصولوں کے شرائط کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ جب افراد کی طبائع مختلف ہوں تو ان سے ایسے اعمال کا سرزد ہونا بھی یقینی ہے جو ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور اس اختلاف کو مٹانے اور کم کرنے کے لئے ہی یہ ضروری ہے کہ آزادی کے باوجود قانون کی پابندی بھی لازمی قرار دی جائے۔

انفرادی اور اجتماعی آزادی سے اس وقت تک پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک کہ اس کے تحفظ کے لئے ملک کے اندر عدالتی اقتدار موجود نہ ہو۔ جو فرد اور

اجتماع کی آزادی کے تحفظ کا ضامن ہو۔

لیکن یہاں پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ سے آزاد ہو اسی لئے عصر جدید میں بہت سی حکومتوں نے اس ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے بنیادی قانون میں مناسب تبدیلیاں کردیں۔ جن کے نتیجہ میں انتظامیہ فرد اور اجتماع کی آزادی میں کم سے کم دخل دیتی ہے اور تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی آزادی کو بہتر صورت میں قائم رکھنے کے لئے اسی طرح کی تبدیلیاں بہت مفید ہوئی ہیں اگرچہ یہ صورت صرف زمانۂ امن میں برقرار رہتی ہے اس لئے کہ جنگ کی حالت میں انتظامیہ مجبور ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی آزادی پر وقت کے تقاضے کے مطابق ضروری پابندیاں عائد کرے۔

اوپر یہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی آزادی کو حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے مطلق العنان حکومتوں کے خلاف انقلاب کی تحریکیں وجود میں آتی رہیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑا انقلاب، فرانس کا انقلاب تھا جو ۱۷۸۹ء سے لے کر ۱۷۹۸ء تک جاری رہا۔ اہل فرانس نے اپنی سیاسی آزادی کے حصول کے لئے اٹھارھویں صدی کے ربع آخر میں انقلاب برپا کیا۔ اس انقلاب میں درمیانی طبقہ کے لوگ پیش پیش تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت نے اونچے طبقوں کی پرورش کے لئے درمیانی طبقے پر بہت بڑا بوجھ ڈال دیا تھا اور چونکہ حکومت مالی طور پر کمزور ہو چکی تھی اس لئے درمیانی طبقہ کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ حکومت ان کی جائدادوں پر قبضہ نہ کرلے۔

اس وجہ سے درمیانی طبقہ کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ حکومت کو

چلانے اور اپنے آپ کو ان قانونی بندشوں سے آزاد کرنے کے قابل ہیں جن کے ذریعے اونچے طبقہ کے لوگوں نے اُن کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔

اس کے علاوہ درمیانی طبقہ اونچے طبقے کے طرزِ عمل سے سخت بدظن ہو چکا تھا اور اس بات کا ارادہ کر چکا تھا کہ وہ جاگیرداری نظام کو ختم کر دے گا۔

چنانچہ انہوں نے اپنے مطالبات مرتب کئے اور بادشاہ سے اس امر کے طالب ہوئے کہ وہ اُن کے مقاصد کے حصول میں جاگیردار طبقہ کی طرفداری نہ کرے۔ لیکن اس عہد کے حکمران لوئی شانزدہم نے اس انقلاب کو اپنے اقتدار کی کمی کا سبب خیال کیا اور درمیانی طبقے کے خلاف سازش شروع کی اور اس انقلاب کو ختم کرنے کے لئے دوسرے ممالک کے بادشاہوں سے بھی امداد چاہی۔

لیکن انقلاب کی آگ بڑھتی رہی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۷۹۸ء میں عوامی انقلاب نے پرانے نظامِ حکومت کو ختم کر دیا۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ تختِ شاہی کو بھی اُلٹ کر رکھ دیا۔ جس کے نتیجہ میں:-

(۱) فرانس میں دستوری حکومت قائم ہو گئی۔

(۲) اہلِ فرانس دستوری اعتبار سے مضبوط ہو گئے۔

(۳) قوانین میں یکرنگی پیدا ہونے کی وجہ سے نیا نظامِ حکومت ایک معیاری نظام قرار پایا۔

(۴) نئے نظام کی رو سے قومی زبان (فرانسیسی) کو خاص ترقی ہوئی۔ اور

(۵) فرانس کا نیا نظامِ حکومت عرصۂ دراز تک قائم رہا۔

باب دوم

تحریکِ آزادیٔ ایران

ایران میں خاندانِ ماد کی حکومت ۷۵۰ ق م سے لے کر انقلاب مشروطیت کے خاتمہ (سنہ ۱۹۰۶ء) تک اقتدار کے حصول کی خاطر عوام پر ظلم وستم ڈھائے گئے ان کی تہذیب تباہ کی گئی اور اس طرح اپنے جذبۂ جہانگیری کو تسکین دینے کی جو کوشش کی گئی وہ تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ لیکن دوسری طرف ایسے انسانوں اور آزادی کے پروانوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جنہوں نے ملک کی آزادی کی خاطر اور لوگوں کو ظالموں کے خونیں پنجوں سے چھڑانے کے لئے اپنی جانوں تک کی بھی پرواہ نہیں کی۔ (بلاشبہ ماد خاندان کے سبب سے لوگوں میں قومی برتری کا احساس ہوا۔ اور اسی جذبہ نے ایران میں آزادی کی بنیاد رکھی گئی)۔

سکندر کا حملہ اور ایرانیوں کی جدوجہد

سکندر کے حملہ کے بعد (۳۳۰ ق م) یونانی تہذیب پورے طور پر ایران پر چھا گئی اور اعلیٰ اور درمیانی طبقوں نے نہ صرف تسلط کو قبول کیا۔ بلکہ یونانی زبان اور تہذیب کو بھی اختیار کر لیا۔ لیکن یہاں بھی ایران کے اس غریب طبقہ کا

پتہ چلتا ہے جنہوں نے جذبۂ آزادی کی خاطر اپنی "ایرانیت" کو قائم رکھا۔ انہوں نے نہ اپنی زبان بدلی نہ لباس۔ ان کے دل میں ایک تڑپ پنہاں تھی جو ان کو حصولِ آزادی کے لئے بیقرار رکھتی تھی۔ ان کے سینہ میں ایک جذبہ تھا جو انہیں شمعِ آزادی پر قربان ہوجانے کے لئے مضطرب رکھتا تھا۔ وہ موقع کے منتظر تھے ان کے باطن میں وطن پرستی کی آگ برابر جل رہی تھی۔ اور جب تک انہوں نے اپنے عزیز وطن کو یونانیوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد نہیں کرالیا، چین سے نہیں بیٹھے۔

چنانچہ یونانیوں کے ورود سے ٹھیک اکیاسی برس بعد (۲۴۹ ق م) میں ایران کے شمال مشرق سے پھر ایک قدیم ایرانی قوم اُٹھی جو "پارت" کے نام سے مشہور تھی۔ اس قوم کے اولالعزم افراد نے متحد ہو کر یونانیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور ایران میں ایک نئے خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی جو تاریخ میں "اشکانی خاندان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان نے ایک سو بیس سال کے عرصہ میں (۱۲۹ ق م) یونانیوں کو ایران سے باہر نکال دیا اور ایرانی قوم کو پھر آزادی کی فضا میں سانس لینا نصیب ہوا۔

اشکانیوں کے عہدِ حکومت (۲۴۹ ق م تا ۲۲۶) میں یونانی تہذیب اور اس کے اثرات کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ایرانیوں کا وہ جذبۂ قومیت جو یونانیوں کے عہد میں دبا ہوا تھا، پھر اُبھرا۔ اور ایرانی عوام "قومیت" کے اعتبار سے پھر اُسی رنگ میں رنگے گئے، جو ہخا منشیوں کے زمانہ میں تھا۔ ان کے عہدِ حکومت میں زبان، لباس، عادات، اطوار، رسوم اور روایات گویا ہر چیز دوبارہ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گئی۔

اشکانیوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ان کے عہدِ حکومت میں ایران کی سابقہ ترقی کے لئے راستہ پھر ہموار ہو گیا اور ان کا جانشین ایک ایسا خاندان ہوا جس کے عہدِ حکومت میں ایران کی سیاسی حدیں بھی ہخامنشی عہد کی حدوں تک پہنچ گئیں۔ یہی نہیں بلکہ ایرانی ذہن میں بھی ایک نئی جِلا پیدا ہو گئی۔ جس نے ایرانی قوم کو اس عہد کی متمدن دنیا میں پہلے سے زیادہ نمایاں کر دیا، اور اُن کے تمام ذہنی اوصاف بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ نمایاں ہو گئے۔

اشکانیوں کے جانشین ساسانی ہوئے اور ان کے عہدِ حکومت میں ایران تمدن کے عروج پر پہنچ گیا۔

سنہ ۶۵۲ء میں عربوں کے ہاتھوں دو سو چھبیس سالہ ساسانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اگرچہ ایرانیوں نے عربوں کا دین قبول کر لیا۔ لیکن عربوں سے نفرت رہی اور یہ نفرت آہستہ آہستہ دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ اس لئے کہ ان کے خیال کے مطابق عربوں نے ان کی قومی حکومت کا خاتمہ کر کے اُن کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔

ایرانی زمانۂ قبل از اسلام میں بھی اس طرح کے دور سے گذر چکے تھے اُن کے اندر وہ اوصاف تھے جو ان کو اس سے پہلے بھی غلامی کی تاریکی سے نکال کر آزادی کی روشنی میں لائے تھے، انہوں نے پھر اُنہی اوصاف سے کام لیا اور اُن کی پیہم کوششوں سے دو سو سال کے بعد عرب خلافت کے اندر ایران میں نیم مستقل اور مستقل حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ یہ حکومتیں بظاہر خلیفۂ بغداد کے ماتحت تھیں لیکن اُن کو ہر طرح کی داخلی آزادی حاصل تھی۔

وقت کے تیز دھارے نے جہاں ایک طرف عربوں کو ضعیف کر دیا، وہاں دوسری طرف ایرانیوں کو نئی قوت عطا کی اور ایران میں یکے بعد دیگرے ایسی حکومتیں وجود میں آتی رہیں جنہوں نے ایرانیوں کی حقیقی سیاسی آزادی کو برقرار رکھا۔

ایران پر تیسرا بڑا حملہ تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں تاتاریوں نے کیا۔ اس حملہ کا آغاز سنہ ۱۲۱۹ء میں اور خاتمہ سنہ ۱۲۵۸ء میں ہوا۔

تاتاری وحشی تھے۔ انسانوں کا خون پیتے اور کتوں کا گوشت کھاتے تھے۔ وہ خونخوار درندے تھے۔ اُن کے آہنی پنجوں سے بچنا مشکل تھا۔ اُن کے حملوں سے نہ صرف ایران تباہ ہوا، بلکہ اسلامی تمدن کو بھی اس قدر شدید ضرب پہنچی کہ اس کے بعد وہ اپنی سابقہ عظمت پر پہنچ نہ سکا۔ علوم و فنون کے ساتھ علماء اور ماہرینِ فن کا بھی یکسر خاتمہ ہو گیا۔ لاکھوں کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اور اسلامی تمدن کے آثار اس بے رحمی کے ساتھ مٹائے گئے کہ اُن کا بیان طاقت سے باہر ہے۔ لاکھوں انسان اُن کی درندگی کا شکار ہو گئے۔ سینکڑوں بستیاں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ غرض یہ کہ ان کے حملوں سے پھر ایک مرتبہ ایرانی قوم کی سیاسی آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔

ایران اور ایرانیوں کی تباہی اور بربادی کا یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر نہ آتا تھا، یہاں تک کہ تاتاری حکمران غازان خان نے سنہ ۱۲۹۵ عیسوی میں دس ہزار تاتاریوں کے ساتھ اسلام قبول کیا۔

تاتاری حملوں سے ایران اور ایرانیت کے جذبہ کو جو صدمہ پہنچا اُس کی

تلافی دوسو سال تک نہ ہو سکی یہاں تک کہ سولہویں صدی کے آغاز میں ایران میں صفوی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔

صفویوں کے دورِ حکومت میں ایرانی ذہن کے خاص اثرات نمایاں ہیں۔ ان کی قومیت اور سیاسی آزادی جو صدیوں سے ختم ہو چکی تھی، ایک مرتبہ پھر پوری قوت کے ساتھ وجود میں آ گئی۔

باب سوم

دستوری آزادی اور اسکا مفہوم

دستوری آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ عوام الناس اپنے ملک کا دستور خود مرتب کریں اور اس کے ذریعہ سے اپنے حقوق کا تحفظ اس طرح سے کریں کہ ملک و ملت کی تقدیر خود افرادِ ملت کے ہاتھوں میں ہو اور وہ اپنے وضع کردہ قوانین کی مدد سے اپنی جان، اپنے مال، اپنے ناموس اور اپنے دین کی حفاظت کرسکیں۔

علم و فضل کسی ایک خاندان میں مخصوص ہوکر نہ رہ جائے بلکہ ہر فطری استعداد رکھنے والوں کو حصولِ علم و فضل کے تمام مواقع میسر آسکیں اور اسی طرح عوام الناس حصولِ تعلیم کے بعد اپنے ملک کی اصلاح اور ترقی میں مشغول ہوجائیں۔

مملکت کے قوانین ایسے ہوں جن کی رو سے امورِ حکومت کا انتظام جو دستوری آزادی سے پہلے صرف حکمران طبقے کے افراد تک محدود تھا۔ عوام الناس کے پاس پہنچ جائیں اور عوام الناس ہی اس کے اہل قرار پائیں۔

ایران میں دستوری آزادی کا حصول ایک ایسا واقعہ ہے جو تاریخ ایران میں ٹھیک دو ہزار چھ سو چودہ سال کے بعد رونما ہوا۔ اور اس واقعہ کے رونما ہونے کے ساتھ اہلِ ایران کی زندگی کے سیاسی، اجتماعی اور تمدّنی پہلوؤں میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی۔ دستوری آزادی نے ایران کے قدیم نظام کو ختم کر دیا اور مطلق العنان حکومت کو جو زمانۂ تاریخ سے بیسویں صدی کے آغاز تک قائم تھی، یکسر ختم کر دیا۔ اور اس کی بنیادوں پر قومی حکومت کی بنیاد رکھی جس کا تعلق زندگی کے نئے فلسفے، فکر اور عدل و انصاف سے ہے۔

دستوری آزادی نے لوگوں کے عقیدہ کی آزادی اور افراد کے حقوق کی مساوات اور عوام کی عوام پر حکومت کو قائم کیا اور ملک و ملّت کے اہم ترین امور کی باگ ڈور کو خود افرادِ ملّت کے سپرد کیا اور ملّت کو اختیار دیا کہ وہ اپنے لئے ایسے قوانین وضع کرے جو ایک آزاد اور مختار اجتماع کے اخلاق اور اس کی بہبودی کے لئے ضروری اور مناسب ہے۔

دستوری آزادی نے اس باطل عقیدہ کو کہ "بادشاہ ظِلُّ اللہ اور برگزیدۂ خدا ہے" اور جس عقیدہ کے اہالیانِ ایران دورِ تاریخ کے آغاز سے معتقد تھے اور جو اُن کی ہزاروں سال کی غلامی اور بدبختی کی جڑ تھی، ختم کر دیا۔ اور اپنے کردار سے اس امر کا ثبوت دیا کہ بادشاہ صرف ملّت کا نمائندہ اور

اجتماع کا چنا ہوا ہے۔ اور جب اس کا کردار مملکت اور اہلِ مملکت کی مصلحتوں کے خلاف ہو گا تو وہ اپنے مقام سے معزول کر دیا جائے گا۔ اور اس کی جگہ ایسا شخص تختِ شاہی پر متمکن ہونے کے لئے منتخب کیا جائے گا جو اس بزرگ ترین منصب کا اہل ہو۔

دستوری آزادی نے لوگوں کی جان، اُن کے مال، ان کے ناموس، ان کی حیثیت اور ان کی شرافت کو جو حکّام کے لئے ذریعۂ عیش تھی، آزاد کیا۔ اور شخصی نفیلت، قابلیت اور لیاقت پر حکومت کی بنیاد رکھی۔

ایران میں دستوری حکومت کے قیام سے پہلے حکومت کے تمام اہم مناصب صرف شاہی خاندان کے افراد اور امرا کے لئے مخصوص تھے۔ یہاں تک کہ ان کے نالائق بیٹے گہوارہ میں بھی سرداری اور امیری کے نشانات کے حامل ہوتے تھے، کامیابی ایسے شخص کے لئے نہیں تھی جو ذاتی لیاقت اور استعداد اور علم وفضل کا مالک ہو، بلکہ اس کے لئے تھی جس کا واسطہ حکمران خاندان سے ہو اور جو شخص یہ واسطہ رکھتا تھا، خواہ وہ جاہل اور فاسد الاخلاق ہی کیوں نہ ہو، حکومت کے عالی ترین مناصب سے سرفراز کیا جاتا تھا۔

دستوری آزادی نے طبقاتی امتیاز کو بھی ختم کیا اور اس رکاوٹ کو دور کر دیا کہ بزرگی اور مرتبے کا حق صرف بڑوں ہی کو پہنچتا ہے اور اس امر کے لئے راستہ کھول دیا کہ عوام الناس بھی فطری لیاقت اور استعداد کی بنا پر حکومت کے بلند ترین عہدوں پر پہنچ جائیں۔

دستوری آزادی نے ایران میں اہلِ ایران پر علم و دانش کا دروازہ کھولا اور جبری تعلیم کے قانون، مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام سے اہالیانِ ایران کو موقع دیا کہ وہ اپنے آپ کو زیورِ علم سے آراستہ کریں۔ اس کے علاوہ منتخب جوانوں کی ایک بڑی تعداد کو یورپ کے متمدن ممالک میں سائنسی اور فنی تعلیم کے لئے بھیجا گیا تاکہ وہ وہاں سے دولتِ علم حاصل کرکے اپنے ملک و ملت کی خدمت بجالائیں۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں ہزاروں افراد تحصیلِ علم کے بعد حکومت کے مختلف کاموں کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے کے قابل ہوگئے اور یہ امتیاز جو دستوری حکومت کے وجود میں آنے سے پہلے صرف طبقۂ امرار کے افراد کے لئے مخصوص تھا، ختم ہوگیا۔

چنانچہ آج حکومت کے تقریباً تمام محکمے ان جوانوں کے ہاتھ میں ہیں جو دوسرے اور تیسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جو دستوری آزادی سے پہلے پست طبقے کے افراد ہونے کی وجہ سے حکومت کے کارخانے میں داخل ہونے کے لئے راستہ نہیں پاتے تھے۔ اس کے علاوہ قدیم امرار اور اشراف کی اولاد جو محض خاندانی شرافت کی بنا پر دولتِ علم سے خالی ہے اور حصولِ تعلیم اور تربیت پر عقیدہ نہیں رکھتی، حکومت کے اہم مناصب حاصل کرنے سے محروم ہے۔

اس لئے یہ بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ دستوری حکومت کے قائم ہونے کا واقعہ ایران کی دو ہزار چھ سو چودہ سالہ تاریخ میں سب سے

بڑا واقعہ ہے جس کی بدولت اہلِ ایران کی سیاسی اور اجتماعی زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا اور ایران و اہالیانِ ایران کی تقدیریں بدل گئیں۔
آئندہ صفحات میں اسی دستوری حکومت کے لئے جدوجہد کی خونیں داستان پیش کی گئی ہے۔

باب چہارم

انقلاب مشروطیت ایران

ویسے تو ایران ہمیشہ مطلق العنان حکومت کا شکار رہا ہے۔ البتہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ایران میں ایک ایسے انقلاب کی بنیاد پڑی۔ جس نے نہ صرف مملکتِ ایران کی سیاسی ہیئت کو بدل دیا بلکہ ایرانی قوم کو جھنجوڑ کر خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور آزادی کا جذبہ ان میں اس حد تک پیدا کر دیا کہ وہ اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لئے بھی تیار ہو گئے تاکہ ایرانی قوم کو تہذیب یافتہ اقوام کی صفوں میں کھڑا دیکھ سکیں۔ تاریخ ایران میں اس انقلاب کا نام "انقلاب مشروطیت ایران" ہے۔ انقلاب مذکور کے آغاز، ارتقا، اور انجام کے حالات حسب ذیل ہیں۔

ناصر الدین شاہ قاچار [۵]
۱۸۴۸ء - ۱۸۹۶ء

اس انقلاب کا آغاز ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں ہوا۔ ناصر الدین شاہ عیش پسند بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ جابرانہ پالیسی کا حامل تھا۔ اس کے خیال میں رعایا پر تب ہی حکومت کی جا سکتی تھی جبکہ وہ بھوکی اور ننگی رہے اسی لئے ملک کی حالت درست کرنا اس کی مصلحت کے خلاف تھا۔ اُس کے اس طرزِ عمل کے باعث صوبوں کے حاکموں کو زیادہ خود مختاری حاصل ہو گئی۔ حکمرانوں نے انتظام میں دلچسپی لینی چھوڑ دی رعایا کو دبائے رکھنے کے لئے جاہل اور سرکش حکام کو اُن پر مسلط کیا جاتا

---

[۵] نادر شاہ کے بعد ملک میں کوئی مرکزی حکومت قائم نہ رہ سکی۔ ایک طرف آزاد خان افغان نے آذر بائیجان پر، دوسری طرف علی مردان خان بختیاری نے اصفہان پر، محمد حسن قاچاری نے استر آباد پر قبضہ کر لیا۔ میر کریم خان زندی نے شاہرخ افشاری پر تاج و تخت لینے کے لئے حملہ کر دیا اور اس خاندان نے ۱۷۵۰ء تا ۱۷۷۹ء (علاوہ صوبہ خراسان) حکومت کی کریم خان کی وفات کے بعد آغا محمد قاچاری اور زندی شاہزادوں کے درمیان تقریباً بارہ برس تک لڑائی رہی۔ آخر کار قاچاری جیت گئے اور تقریباً ڈیڑھ سو برس تک حکومت کرتے رہے۔

سلاطین قاچار

(۱) آقا محمد خان ۱۷۷۹ء / ۱۱۹۳ھ
(۲) فتح علی شاہ ۱۷۹۷ء / ۱۲۱۱ھ
(۳) محمد شاہ ۱۸۳۴ء / ۱۲۵۰ھ
(۴) ناصر الدین شاہ ۱۸۴۸ء / ۱۲۶۴ھ
(۵) مظفر الدین شاہ ۱۸۹۶ء / ۱۳۱۴ھ
(۶) محمد علی شاہ ۱۹۰۶ء / ۱۳۲۴ھ
(۷) احمد شاہ ۱۹۰۸ء / ۱۳۲۶ھ
تا
۱۹۲۵ء / ۱۳۴۴ھ

از لین پول۔ سلاطین اسلام صفحہ ۲۸

رہا۔ جن کی چیرہ دستیوں نے عوام کو بد سے بدتر بنادیا اور جس کے نتیجہ میں ملک میں بدامنی اور اقتصادی بدحالی کا دور دورہ ہو گیا۔

محکمۂ فوج | ایرانی فوج دو حصوں میں منقسم تھی۔ مرکزی اور صوبائی۔ مرکزی فوج طہران میں رہتی تھی اور اُس کے مصارف خزانۂ شاہی سے پورے ہوتے تھے۔ صوبائی فوج کی تنظیم اور اس کے اخراجات کی ذمہ داری صوبہ کے حاکم پر ہوتی تھی اور ضرورت کے وقت حاکم صوبہ کو اپنی فوجیں مرکز میں بھیجنی پڑتی تھیں۔

اکثر صوبائی صدر مقام مرکز سے دور ہونے کے سبب صوبائی حاکم مطلق العنان اور خود مختار ہو جاتے تھے اور بسا اوقات خود مختاری کا اعلان بھی کر بیٹھتے تھے۔

رسل و رسائل کی عدم سہولت کے باعث صوبہ عملی طور پر مرکز سے منقطع ہو جاتا تھا اور چونکہ اکثر شاہزادے بھی حاکم صوبہ ہوتے تھے۔ اس لئے ان کے امور میں مرکز یا صوبہ کے اعیان دولت کا دخل دینا محال تھا۔ فوج کی ترتیب ناقص تھی۔ چونکہ حاکم صوبہ اصول فوج داری سے نہ خود واقف تھے اور نہ ہی اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ سپاہی فنونِ جنگ کے جدید طریقوں سے کیا واقف ہوتے۔ اور پھر جبکہ سامانِ جنگ اور حالاتِ حرب بھی ناقص ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ سپاہیوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ ان کی وردیاں پھٹی ہوئی ہوتیں۔ اور پیٹ خالی۔ لہٰذا سپاہی بھی موقع ملنے پر ظلم کا ہاتھ رعایا پر دراز کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

محکمۂ مالیات | مالیہ جنس اور نقدی کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا اور اُس

وقت مملکت کی کل سالانہ آمدنی تقریباً پینتیس لاکھ روپے تھی جو اتنی بڑی مملکت کی حقیقی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناکافی تھی۔ اس رقم کا معتدبہ حصہ تو بادشاہ کی ضرورت کے لئے صرف ہوجاتا تھا اور بقیہ رقم حکومت کے مختلف محکموں پر صرف ہوتی، جہاں محکموں کے سربراہ پہلے اپنی ضرورتیں پوری کرلیتے پھر بقیہ رقم حسب منشا، حکومت کے کاموں پر صرف کرلے۔ عملے کی تنخواہیں ناکافی اور مقررہ وقت پر نہ ملنے کے سبب رشوت کا بازار گرم تھا۔ اور اس طرح عوام پستے چلے جاتے تھے۔

محکمۂ عدالت

حقیقت میں عوام، بادشاہ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے تابع تھے۔ بادشاہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں تھا۔ اس کا دربار ہی مجلسِ عدالت تھا۔ اس کا ارادہ قانونِ الٰہی اور اس کی اطاعت خدا کی اطاعت تھی۔ اسی طرح بادشاہ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حاکم اپنے وقت کے مطلق العنان حاکم سمجھے جاتے تھے۔

محکمۂ تعلیم

ملک کی تعلیمی حالت بہت خراب تھی۔ بالعموم پرانی وضع کے مدارس تھے جن میں صرف ادبیاتِ قدیم، فلسفہ، منطق اور دینیات وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جدید تعلیم کا حصول علماء کی نگاہ میں اسلام سے خارج ہوجانے کے مترادف تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام الناس علم سے بے بہرہ رہے۔

اگرچہ طہران میں پچھلی صدی کے نصف اوّل کے آغاز میں ایسی درسگاہیں قائم ہوچکی تھیں جن میں یورپ سے بلائے ہوئے اساتذہ جدید علوم کی تعلیم دیتے

تھے۔ لیکن ان درسگاہوں میں داخلہ صرف اُنہی طلبار کو ملتا تھا جن کا تعلق شاہی خاندان سے ہو یا امرا۔ اور اشراف کے خاندانوں سے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ایران کی وسیع حکومت میں تعلیم کہاں تک پھیل سکتی تھی۔

اس کے علاوہ بادشاہ کا منشار بھی یہی تھا کہ عوام الناس جاہل رہیں، تاکہ جدید علوم کی روشنی سے بہرہ مند ہو کر وہ اس کے خلاف کوئی تحریک نہ کر سکیں۔ چنانچہ عوام الناس کو جاہل رکھ کر اُس نے اپنے خیال کے مطابق اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

باوجود اس کے جو لوگ سیاحت کے لئے یورپ گئے، انہوں نے وہاں کی تعلیمی حالت کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا تو انہوں نے اس امر کا تہیہ کر لیا کہ وہاں سے واپس آکر وہ بھی اپنے بچوں کو جدید تعلیم دیں گے اور اس طرح اُن کی تربیت کریں گے کہ وہ آگے چل کر اپنے ملک میں تعلیمی حالت کو بہتر بنانے میں کوئی عملی اقدام کر سکیں۔

اگرچہ اس طرح کی امیدیں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی رہیں لیکن وہ پچھلی صدی کے آخر تک پوری نہ ہو سکیں۔

اہالیِ ایران اہالیِ ایران حسب ذیل چار طبقوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) بادشاہ اور اسکا خاندان دورِ استبدادیت میں ملت کا انفرادی وجود کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی جماعت تھے جو بغیر ارادہ اور عقیدہ کے بادشاہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ وہ ہر

طرح سے بادشاہ کے ہوائے نفس کے تابع تھے۔ وہ بلا استثناء بادشاہ کے غلام تھے اور افرادِ ملّت کی تمام چیزیں بادشاہ کے اختیار میں تھیں۔ بادشاہِ وقت صرف اپنے میل اور ارادہ سے حکومت کرتا تھا۔ وہ خود اپنے خیال میں سایۂ خدا تھا اور اسی لئے وہ کسی انسان کے سامنے جواب دہ نہیں تھا۔ اس کا ارادہ قانونِ الٰہی تھا۔ اس کی برہمئ مزاج ہزاروں انسانوں کی بدبختی کا سبب بن جاتی تھی۔

بقولِ سعدیؔ :- "گاہی بسلامی برنجند وگاہی بدشنامی خلعت می دہند"

اس امر کا بھی امکان تھا کہ ایک زر خرید غلام محض بادشاہ کی عطف توجہ سے مسندِ صدارت پر پہنچ جائے اور کوئی صدرِ اعظم بادشاہ کی ناراضگی کے نتیجہ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بادشاہ کو خوش رکھنا عام لوگوں اور خصوصاً ندیموں کا فرضِ اوّلین تھا۔ اسی لئے بادشاہ کی عنایتوں سے صرف وہی لوگ سرفراز ہوتے تھے جو بادشاہ کو خوش رکھ سکیں۔ مزید برآں یہ کہ وہ عوام پر زیادتی کرنے کے بعد بادشاہ کی پناہ میں بھی آجاتے تھے۔ جو شخص زیادہ چرب زبان ہوتا اسی قدر بادشاہ کی عنایت سے بہرہ ور ہوتا۔ یہی سبب تھا کہ ایران میں چاپلوس اور تملق گو زیادہ پیدا ہو گئے اور اس کا رواج تعلیمی تمدنی مراکز میں بھی عام ہو گیا اور یہی چیز خاص و عام کے لئے پسندِ خاطر بن گئی۔

بعض اوقات ایسے لوگ بھی سلطنت کے رکن بنے ہیں جنہیں انصاف تو پسند تھا اور وہ ظلم و ستم بھی ناپسند کرتے تھے لیکن ارکینِ سلطنت ہونے

کی وجہ سے وہ بھی بادشاہ کی خوشنودیٔ مزاج کو مقدم خیال کرتے تھے اور دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنے سے باز رہتے اور جب ملّت کے حقوق کے متعلق ان سے گفتگو کی جاتی تو وہ کہہ دیتے کہ "لوگوں میں سیاسی مراعات حاصل کرنے کی قابلیت ہی نہیں ہے۔"

شاہی خاندان کے نالائق افراد بھی قابلِ تعظیم سمجھے جاتے تھے۔ حصولِ مرتبہ کے لئے علم وفضل اور لیاقت و استعداد حاصل کرنے کے بجائے اس خاندان کا فرد ہونا شرط ہے۔ انہی کے لئے عظمتِ حقیقی تھی اور اُس خاندان کے مخصوص افراد کے علاوہ کوئی دوسرا فرد اس درجہ پر پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔

۲۔ علماء

یہ طبقہ علمائے ظاہر پر مشتمل تھا۔ ان کو محض جاہ طلبی کی ہوس تھی۔ لوگ اس طبقہ میں صرف اس وجہ سے داخل ہوتے تھے کہ وہ ان کی صف میں آکر عزتِ دنیاوی حاصل کرلیں۔ اسی لئے دوسروں پر تفوق حاصل کرنے کی کوشش میں وہ ظاہر داری برتتے تھے۔

ظاہری علامتوں میں لمبی داڑھیاں، بڑی پگڑیاں اور کھلی عبائیں ضروری تھیں۔ مجلسِ درس میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ اس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ وہ لوگ جو صحیح معنوں میں علم وفضل کے پیکر تھے، گوشہ نشین ہوگئے۔ اور عوام النّاس سے ان کا زیادہ سروکار نہ رہا۔

ان علمائے ظاہری نے اسلام کی روح کو بھلا دیا۔ دوسروں کو تو مفہومِ قرآنی کیا سمجھاتے، وہ خود ہی نہ سمجھ سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مذاہب کے لوگ اسلام اور قرآن کا مضحکہ اڑانے لگے۔ یہاں تک کہ لارڈ گلیڈ سٹون نے

مجلس عوام میں ایک دفعہ کہا "جب تک قرآن مجید مسلمانوں میں حکمرانی کرتا ہے وہ تمدن سے آشنا نہ ہونگے۔"

عجب اتفاق ہے کہ اگر متقی علماء، علماء ظاہر کے اعمالِ ناشائستہ پر تنقید کرتے تو ان کو متہم کیا جاتا۔ چنانچہ شیخ ہادی انجم آبادی نے (جو علم و تقویٰ کے ستون تھے) جب ایک ظاہری عالم پر تنقید کی تو ان کو متہم کیا گیا۔

۳۔ متوسط طبقہ یہ طبقہ اقلیت اور روشن فکر افراد پر مشتمل تھا۔ یہی لوگ جدید تہذیب و تمدن کی تشکیل کے طرفدار تھے۔ یہ لوگ ملک کی ابتر حالت سے افسردہ خاطر تھے۔ لیکن دنیا کے عام حالات سے چنداں باخبر نہ تھے۔ اس لئے یہ لوگ اگر ایک طرف ظالم حاکموں کے ہاتھوں تکلیف اٹھاتے تو دوسری طرف علمائے ظاہر کا تختۂ مشق بنتے۔

ان میں سے بعض لوگوں نے فلاح و نجات دینی اور عرفانی علوم کے حصول میں سمجھی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمائے ظاہر نے ان کی آزاد خیالی کی بناء پر شیخی و بابی کہہ کر ان کو متہم کرنا شروع کر دیا۔ ان آزاد خیالوں کو بے دین کا خطاب دیا گیا اور "مخالفین شرع دینِ متین" کہہ کر ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا۔ جدید تعلیم کی جانب رجحان ہونے کی بناء پر ایسے لوگوں کو فرنگی مآب سمجھا گیا۔ ان لوگوں کے لئے عدالت کے دروازے بھی بند کئے گئے گویا تمدن جدید کی طرفداری ناقابلِ معافی جرم تھا۔

۴۔ طبقہ عوام ان کی بے خبری کا یہ عالم تھا کہ علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور آزادی و خود مختاری کا احساس تک نہ تھا۔ تنگ د

تاریک مکانوں میں زندگی بسر کرنا اُن کی قسمت میں تھا اور یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ یہ لوگ حیوانوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔

اسی لئے جب اعلیٰ طبقہ کے افراد اِن کی بدبختی کی طرف دیکھتے تو کہتے "خدا نے ان کو اسی لئے پیدا کیا ہے۔ یہ لوگ دوسروں کی خدمت کے لئے ہیں۔ ان کو خدمت گزار بن کر ہی رہنا چاہیئے اور یہی حالت ان کے اور ملک کے لئے بہتر ہے۔"

بادشاہ اور اس کے خاندان کے افراد کے علاوہ دیگر افراد کے لئے بالعموم مغربی ممالک میں جانا ممنوع تھا۔ خصوصاً ان ممالک میں جہاں قومی حکومتیں قائم تھیں۔ حکومت اس امر کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ایرانی دوسرے ممالک کے ساتھ رابطہ پیدا کریں، مبادا وہ جدید تہذیب و تمدن سے آشنا ہو جائیں۔ اس امر کی تصدیق اس واقعہ سے ہو سکتی ہے، کہ جب ناصر الدین شاہ کا داماد مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے بہانے سے یورپ کی سیر کے لئے گیا تو اس کے نتیجہ میں کئی سال تک بادشاہ اس سے ناراض رہا۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے حالات عوام النّاس کے دلوں میں انقلاب کا احساس پیدا کرنے کا باعث ہوئے۔ جس قدر پابندیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ اسی قدر لوگوں میں ان پابندیوں کو توڑنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

ناصر الدین شاہ قاچار نے ۱۸۷۳ء، اور ۱۸۸۵ء میں پے در پے یورپ کے تین سفر کئے۔ تیسرے سفر کے دوران میونخ (جرمنی) میں اسکی

[ملا]قات "سید جمال الدین افغانی" سے ہوئی۔ وہ سید صاحب کی شہرت سے واقف [ت]ھا۔ ملنے کے بعد ان کی بلند شخصیت، علمی قابلیت، سیاسی بلندئ فکر سے اس [ق]در متاثر ہوا کہ اس نے ان کو ایران آنے کی دعوت دی جس کو انہوں نے قبول [ک]رلیا۔ چنانچہ ان کے ایران آنے پر ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان کا دروازہ ہر [و]قت ہر ایک کے لیے کھلا ہوا تھا۔ لوگ ان سے ملتے اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوتے۔ لیکن ان کی نگاہوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں تاڑ لیا کہ دراصل ایران کی پستی اور نکبت کا واحد سبب صرف بادشاہ کی ذات ہے۔

جب بادشاہ کو ان کے سیاسی عقائد کی اطلاع ملی تو وہ ان سے بدظن ہوگیا اور وہ مجبور ہوکر طہران کے باہر شاہ عبدالعظیم کے مقام پر گوشہ گیر ہوگئے لیکن بادشاہ کی طرف سے اس امر کی پابندی لگادی گئی کہ لوگ ان سے ملاقات نہ کریں لیکن پھر جانے والوں کا تانتا نہ ٹوٹا۔ انہوں نے کھلم کھلا بادشاہ کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایران میں آزادی کا صور پھونکا جس کی پاداش میں بادشاہ کے حکم سے ان کو ملک بدر کردیا گیا۔ لیکن آزادی کا جو بیج انہوں نے عوام کے دل میں بو دیا تھا وہ پھوٹا اور بڑھ کر ایک درخت بنا اور جس کی شاخوں نے آہستہ آہستہ تمام ایران کو اپنے سایہ میں لے لیا۔ اس اثناء میں ناصر الدین قاچار نے تمام ایران کے تمباکو کی خرید و فروخت کا ٹھیکہ [۵] ایک انگریزی کمپنی کو ان شرائط پر دیدیا۔

۵۔ تفصیل صـ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) تمام ایران کے تمباکو کی خرید و فروخت کا حق کمپنی کو ہو گا۔
(۲) کمپنی (جس نے اس سلسلہ میں پانچ لاکھ پونڈ سالانہ منافع کا تخمینہ لگایا تھا) پندرہ ہزار پونڈ اور کل منافع کا ایک چوتھائی حصہ سالانہ حکومتِ ایران کو دے گی۔

انگریزوں نے اس طرح تمام مقامات پر اپنے نمائندے چھوڑ دیئے۔ ہر شہر میں سوار مقرر کر دیئے کہ وہ ان کے احکام کی تعمیل کریں اور ان سواروں کو ساز و سامان اور جدید اسلحہ سے مسلح کر دیا۔ اس طرح گویا یہ کمپنی ایک خود مختار جماعت ہو گئی۔ اس کے اراکین نے رعایا کے ساتھ تشدد آمیز پالیسی اختیار کی، اور دوسری طرف ایرانی حکام جو کمپنی سے رشوتیں لے کر پل رہے تھے، کمپنی کے طرفدار تھے اور ہر روز یہ احکام صادر ہوتے تھے کہ کمپنی کی ہر طرح مدد کی جائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاجروں کی خصوصاً اور رعایا کی عموماً جان ضیق میں آگئی۔ لیکن وہ اس کا کوئی تدارک نہ کر سکے۔ چنانچہ جب حقیقی علماء نے عوام النّاس کے

---

۵ (از ص ۲۵) ویسے بھی مملکتِ ایران انیسویں صدی ہی سے دنیا کی دو زبردست طاقتوں کی حریفانہ کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔ ایک طرف سے روس کا دباؤ بے حد تھا، دوسری طرف سے انگریزوں کا، اور یہ اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ خود ناصرالدین قاچار نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے "میں چاہتا ہوں کہ اپنی مملکت کے شمال میں جاؤں تو انگریزی سفیر اعتراض کرتا ہے اور اگر جنوب میں جاؤں تو روسی سفیر مانع ہے۔ جہنم میں جائے یہ سلطنت جائے کہ جس کا بادشاہ خود اپنی مملکت کے شمال یا جنوب میں نہ جا سکے۔"
اسی دباؤ کے نتیجہ میں ناصرالدین قاچار نے ایران کے تمباکو کی خرید و فروخت کا ٹھیکہ انگریزوں کی کمپنی کو دیا۔

...مائب کا احساس کیا تو انہوں نے رعایا کو انگریزی کمپنی کے مظالم سے نجات ...لانے کے لئے تمباکو کے حرام ہونے کا فتویٰ دیدیا۔ دوسری طرف ۱۲ ستمبر ۱۸۹۰ء ...حکومت برطانیہ کے ایما پر طہران میں "امپریل بنک آف ایران" کا قیام عمل ...ں آیا۔

مذکورہ واقعات اور علماء کے فتویٰ نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ چنانچہ ...باکو کے سلسلہ میں جب آقا سید علی اکبر نے شیراز میں عَلَم مخالفت بلند کیا تو ان ...و ایران سے نکال دیا گیا۔ بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور طہران، قزوین، ...بریز میں فسادات رونما ہونے شروع ہو گئے۔

بادشاہ نے تبریز کے مجتہد کے پاس کچھ تحفے بھی بھیجے۔ لیکن جب بادشاہ ...کا نمائندہ تبریز پہنچا تو تمام شہر میں مکمل ہڑتال ہوگئی۔ اور ایک کتے کے گلے ...ں نمائندۂ شاہ کا نام لٹکا کر گلی کوچوں میں گشت کرایا گیا۔ ولی عہد نے بادشاہ کے ...س کے حکم کے باوجود کہ تمام افواج کو مسلح کر کے ان لوگوں کے مقابلے میں لایا ...جائے، اس بات کو ماننے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ایسا نہ ہو کہ فوج میں بھی ...بغاوت کے آثار نمایاں ہو جائیں۔

طہران میں خصوصیت کے ساتھ بغاوت کی آگ تیز ہو گئی اور اس فساد ...میں عوام نے کھل کر پولیس کا مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں تین اشخاص ہلاک ہوئے ...دوسری طرف دیواروں پر یہ اشتہار چسپاں کئے ہوئے دیکھے گئے کہ علماء نے ...اذن جہاد دے دیا ہے۔

فساد و شورش نے اس قدر طول کھینچا کہ بادشاہ نے مجبور ہو کر ٹھیکہ منسوخ

کر دیا اور پانچ لاکھ پونڈ کمپنی کو بطور تاوان دیئے۔ تاوان کی یہ رقم چھ فیصد سود پر امپریل بنک آف ایران سے قرض لی گئی اور اس کے عوض خلیج فارس کے محصول کی چوکیاں اُس کے پاس گروی رکھ دی گئیں۔ گویا یہ پہلا قرض جس کا بوجھ بادشاہ کی خودغرضی سے ایرانی عوام کے کمزور کاندھوں پر ڈالا گیا۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے بجٹ میں عدم توازن پیدا ہو گیا یہاں تک کہ نصف کے قریب سرکاری ملازمین کی تنخواہ بھی سال بھر میں پورے طور پر ادا نہیں ہوتی تھی۔ دوسری طرف بادشاہ کی طرف سے جاسوسوں کا جال پھیل گیا۔ ذرا ذرا سی بات کی خبر بادشاہ کو پہنچنے لگی، اور جہاں بھی اس بات کا پتہ چلتا کہ ملک کے کسی حصہ میں ترقی پسند جماعتوں کا کوئی فرد یا گروہ ملک کی موجودہ حالت پر اظہارِ افسوس کرتا ہے تو ان کو عبرتناک سزائیں دی جاتیں۔

چنانچہ طہران کا ایک واقعہ اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہے کہ ایک محلہ میں

۵۔ ناصرالدین شاہ کے عہد میں جو علاقے ایران سے نکل گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) افغانستان کی علیحدگی۔

(۲) صوبہ خراسان سے کچھ علاقے کا نکل جانا۔

(۳) مرو و سرخس کا ہاتھ سے نکل جانا۔

(۴) ترکمنستان کا ایران سے نکل جانا۔

(۵) عمان اور خلیج فارس کے ۱۰۳ جزیروں کا دوسروں کے قبضوں میں آجانا۔

(۶) نصف بلوچستان ہاتھ سے گیا۔

مزید برآں یہ کہ کردستان، آذربائیجان اور استرآباد کے اطراف میں لڑائی جھگڑے

چند روشن فکر افراد جمع ہو کر سیاسی امور پر گفتگو کر رہے تھے اور بادشاہ پر تنقید کرنے میں مصروف تھے کہ جاسوسوں کے ذریعہ بادشاہ تک اطلاع پہنچی اور اس جرم میں اٹھارہ آدمیوں کو پکڑ کر ایک گہرے کنویں میں ڈال دیا گیا، اور بادشاہ نے خود اُن پر گولیاں چلائیں اور ان سب نے اسی چیخ و پکار کے عالم میں اپنی جان خدا کے سپرد کر دی۔ بادشاہ کے حکم سے اس کنویں کو مٹی سے بھر دیا گیا۔

اسی طرح کا ایک دوسرا دردناک واقعہ کرمان میں ہوا۔ اُس وقت کرمان کا حاکم ایک قاچاری شہزادہ تھا۔ اُس زمانے میں روٹی کا سخت قحط تھا اور شاہزادے نے نان بائیوں کی دوکان پر پہرہ بٹھا دیا تھا کہ جو لوگ روٹی خریدنے آئیں وہ حکومت کو ٹیکس دیں۔ ایک دن ایک چودہ سالہ بچہ روٹی لینے کے لئے ایک دوکان پر آیا تو اس نے سپاہیوں کے مطالبہ پر جواب دیا کہ میری ماں نے فقط ایک "عباسی" مجھ کو دی ہے اور میرے پاس کوئی اور پیسہ سوائے اس کے نہیں ہے۔ تو سپاہی اس کو پکڑ کر لے گئے اور شاہزادے سے کہا کہ یہ لڑکا لوگوں کو شورش پر آمادہ کر رہا تھا۔ شاہزادے نے بغیر تحقیق کے حکم دیدیا کہ اس بچہ کو قتل کر دیا جائے اور اس کی ماں کے پاس اس کا سر روٹی کی بجائے بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم پر عمل کیا گیا۔

خود بادشاہ کی بدعہدیوں کے سبب سینکڑوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بادشاہ جن لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے قسمیں کھاتا

تھا، موقع پاتے ہی انھیں قتل کروا ڈالتا تھا۔

خود بادشاہ کی زندگی عیاشیوں میں بسر ہوتی تھی۔ اس کے حرم میں تین سو عورتیں تھیں اور اس طرح ملک کی تمام آمدنی اس کی عیاشانہ زندگی پر خرچ ہوتی تھی اور ملک دن بدن غریب ہوتا جا رہا تھا۔ ممالک خارجہ کے سفیروں کا اقتدار (جن میں روس اور انگریز زیادہ حصہ لیتے تھے) اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ ملک کے اندرونی معاملات میں بھی کھلم کھلا دخل دینے لگے۔

ظاہر ہے کہ ان تمام حالات اور سید جمال الدین کی پُرتاثیر تقریروں نے لوگوں کے دلوں کو اتنا گرما دیا کہ اب انہوں نے ایسے انسان کو ختم کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ چنانچہ یکم مئی ۱۸۹۶ء کو بادشاہ، سیّد جمال الدین افغانی کے ایک مرید میرزا رضا[۵] خان کرمانی کے ہاتھوں طہران کے باہر شاہ عبدالعظیم کے مقام پر قتل ہو گیا۔

۵۔ میرزا رضا کرمانی، ملا حسین عقدائی کا لڑکا تھا۔ جوانی کے زمانے میں سید جمال الدین افغانی سے ملا۔ ان کی شیریں بیانی اور اعلیٰ نظریات سے اس حد تک متاثر ہوا کہ ہر جگہ ان کے خیالات پھیلانے لگا۔ سید (مرحوم) کے ایران سے نکالے جانے پر بھی یہ کرمان میں ان کے نظریات عام کرتا رہا۔ اسی جرم میں ۲ سال کی سزا ہوئی۔ علماء کی سفارش پر قید سے چھوٹا تو طہران آکر حاکم کرمان کے ظلم کے خلاف پر زور احتجاج کیا جس کے نتیجے میں دوبارہ پکڑا گیا اور قید میں سخت تکلیفیں اٹھائیں۔

سید صاحب موصوف کے دوبارہ ایران آنے پر ان کے ساتھ اسکی محبت میں اضافہ ہو گیا اور وہ ان کا اور بھی معتقد ہو گیا۔ اس کا بیان ہے کہ جب میں نے اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں کا ذکر سید صاحب سے کیا تو انہوں نے خفا ہو کر فرمایا "کیا تو ظلم قبول کرنے کی سکت رکھتا ہے؟" بس اس بات کا اس کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ناصر الدین شاہ کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ دقوعہ عمل میں آیا۔

مظفر الدین شاہ قاچار ۱۸۹۶ء - ۱۹۰۷ء

ناصر الدین شاہ کے قتل کے بعد اس کا بیٹا مظفر الدین شاہ تخت پر بیٹھا۔ یہ ایک آرام طلب، ضعیف الخیال اور نرم طبیعت شخص تھا۔ ملک کی گری ہوئی حالت سنبھالنے کے لئے جس مضبوط ارادے اور حالات کا صحیح طور پر مشاہدہ کرنیوالی قوت کا ہونا ضروری تھا، وہ اس میں بالکل مفقود تھی۔ اُدھر عوام میں جذبہ بیداری ترقی پذیر تھا۔ چنانچہ بدلتے ہوئے حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے اُس نے میرزا علی اصغر خان امین السلطان آتابک اعظم کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور خود ۱۹۰۰ء میں چوبیس لاکھ پونڈ پانچ فیصدی سود پر حکومت روس سے قرض لیکر یورپ کی سیاحت کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس قرض کے عوض خلیج فارس کے محصول کی چوکیوں کے علاوہ (جو ناصر الدین شاہ کے عہد میں ۱۸۹۲ء میں امپریل بنک آف ایران کے پاس گروی رکھ دی گئی تھیں) تمام ایران کے محصول کی چوکیاں حکومتِ روس کے پاس گروی رکھ دی گئیں۔ اس کے علاوہ دوسری مرتبہ پھر بادشاہ نے ۱۹۰۲ء میں دس لاکھ پونڈ حکومتِ روس سے اور قرض لئے اور دوبارہ یورپ کے سفر پر روانہ ہوگیا۔

مطالبۂ عوام

عوام میں اس کی سیر و سیاحت اور اس کے بے جا مصارف کی وجہ سے بہت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ ملتِ ایران نے اس کی مطلق العنانی کو رد کرنے کے لئے ملک میں حکومت مشروطہ (یا پارلیمانی طرزِ حکومت) کے قیام کا مطالبہ پیش کیا اور ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں علی الترتیب اہالیانِ طہران نے "شاہ عبد العظیم" اور قم میں بست اختیار کیا۔ یعنی وہ شاہ

کے خلاف احتجاج کے طور پر ان مقدس مقامات میں پناہ گزین ہوئے۔ تاریخ ایران میں پہلا بست "ہجرتِ صغریٰ" اور دوسرا "ہجرتِ کبریٰ" کہلاتا ہے۔

بالآخر مظفر الدین شاہ نے مجبور ہو کر ۵ر اگست ۱۹۰۶ء کو بسترِ علالت پر حکومتِ مشروطہ کے قیام کے فرمان پر دستخط کر دیئے اور اہلِ طہران نے اس خوشی میں "فتحِ ملی" کے نام سے ایک زبردست جشن منایا۔

۷ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مجلسِ ملی کا افتتاح ہوا اور ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو اس کے بنیادی قوانین اعلان کیا گیا۔

مظفر الدین شاہ ۸ر جنوری ۱۹۰۷ء کو فوت ہوا اور اس کا بیٹا محمد علی شاہ تخت نشین ہوا۔

محمد علی شاہ قاچار ۱۹۰۷ء - ۱۹۰۹ء

محمد علی شاہ قاچار اپنے زمانۂ ولیعہدی سے آزادی خواہوں اور پارلیمانی حکومت کے حامیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ بادشاہ بن جانے کے بعد اس نے اس طرزِ حکومت کو ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ مجلسِ ملی کے وجود کو اپنی خود مختاری کی راہ میں حائل سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے میرزا علی اصغر خان امین السلطان آتابک اعظم کو اس مقصد کے لئے صدارتِ عظمیٰ کے لئے منتخب کیا کہ وہ اس کو اس مقصد کے پورا کرنے میں مدد دے۔

چنانچہ آتابک اعظم نے عہدۂ صدارت عظمیٰ سنبھالتے ہی جہاں ایک طرف اپنے آپ کو مجلسِ ملی کا حامی اور طرفدار ظاہر کیا۔ وہاں دوسری طرف مخفی طور پر حکومت کے اعلیٰ افسروں اور بعض علماء کو اس کے خلاف بھڑکایا تاکہ ملک میں

بے چینی پھیلے اور عوام کی نگاہوں میں مجلسِ ملّی کا وقار گر جائے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں عباس آقا تبریزی کے ہاتھوں، جو انجمن فدایانِ ملّت آذر بائیجان کا رکن تھا، قتل ہو گیا۔

چہلم عباس آقا

ملک المتکلمین اور سید جمال الدین واعظ نے لوگوں کو وطن کی راہ میں تکلیفیں اٹھانے اور قربانیاں دینے کے لئے ابھارنے کی خاطر اور آزادی کی برتری اور بہتری کو عوام میں مقبول کرنے کے لئے یہ طے کیا کہ ایک ایسے شخص کی عظمت اور قربانی کی یادگار قائم کرنے کے لئے مناسب اور شایاں طور پر چہلم منایا جائے۔ اور اس امر کا اعلان کرا دیا گیا کہ عباس آقا کا چہلم اس کے مزار پر منعقد ہو گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں خاص انتظامات کئے گئے۔

تمام اہلِ شہر نے مکمل طور پر ہڑتال کی۔ تقریباً پچاس ہزار آدمی اس روز وہاں جمع ہوئے اور اس قدر اس کی قبر پر پھول چڑھائے گئے کہ قبر پھولوں میں تبدیل ہو گئی۔ ملک المتکلمین نے حسب ذیل آیۂ قرآنی کو عنوان قرار دے کر ایک پُرجوش تقریر کی۔ "لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝" اسی شام کو محمد علی بادشاہ نے مرزا صالح حاکم طہران کو قصرِ شاہی میں بلایا۔ اس نے جا کر دیکھا کہ بادشاہ غیظ و غضب کی حالت میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا اور درباری سہم کر ایک طرف کھڑے تھے۔ میرزا صالح کو دیکھتے ہی اُس نے چلّا کر کہا کہ "تو کیسا حاکم ہے۔ آج

۱۔ یہ دونوں حضرات نئی اصلاحات کے دلدادہ تھے جو آگے چل کر آزادی کے رہبر بنے اور جن کا مفصل ذکر بعد میں پیش کیا گیا ہے۔

ہڑتال کیوں ہوئی اور بازار کس لئے بند ہوئے، شہر میں یہ شور و شغب کیوں برپا ہے؟" مرزا صالح نے دست بستہ عرض کی کہ "میں قوم کے احساسات کو کس طرح روک سکتا ہوں؟" قوم کا لفظ زبان سے نکلتے ہی وہ غضبناک ہو گیا۔ اور مرزا صالح کی طرف دوڑا۔ اگر بادشاہ کے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو وہ یقیناً اس کو قتل کر دیتا اور زور سے چلا کر کہا۔ "میں تمہیں بتا دوں گا کہ قوم کس چیز کا نام ہے؟"

ایک خوشامدی درباری نے آگے بڑھ کر عرض کی۔ "حضور! آدمیوں کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ لوگ تو اتابک کے قتل ہونے پر اظہار افسوس کر رہے ہیں۔ البتہ یہ صرف ملک المتکلمین اور سید جمال الدین واعظ کی لگائی ہوئی آگ ہے۔" ملک المتکلمین اور سید جمال الدین واعظ کا نام سننا تھا کہ محمد علی شاہ غصے میں لال ہو گیا اور ایک مرتبہ پھر چلا کر کہا۔ "آیا کوئی ایسا باغیرت آدمی ہے جو ان دونوں کو ختم کر دے۔

اسی دوران میں پارلیمنٹ نے بعض ایسے قانون منظور کئے جن کی رو سے بادشاہ اور شاہزادوں کے سالانہ مصارف میں جو بے جا طور پہ زیادہ تھے، کمی کر دی گئی۔

ان فیصلوں سے محمد علی شاہ کی دشمنی اراکین پارلیمنٹ کے ساتھ اور بڑھ گئی۔

ذیل میں وہ اسباب پیش کئے جاتے ہیں جن کی بنا پر پارلیمنٹ کے چند روشن فکر افراد نے جو تعداد کے لحاظ سے زیادہ نہیں تھے، پارلیمنٹ میں زیادہ اثر پیدا کر لیا تھا۔

(۱) اراکین پارلیمنٹ کی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی۔

(۲) محمد علی شاہ کے ساتھ مخالفت اور حکومت کی خودسرانہ پالیسی پر بے لاگ تنقید۔
(۳) ملک المتکلمین اور سید جمال الدین واعظ جیسے ذی اثر حضرات کی امداد۔
(۴) قومی اخبارات (صورِ اسرافیل، روح القدس اور مساوات) کا تعاون۔
(۵) انقلابی کمیٹی کی تشکیل۔
(۶) قومی فوج کی تشکیل۔
(۷) تبریز میں انجمن آذر بائیجان اور قزوین میں انجمن برادران کی تشکیل۔
(۸) حیدر خاں عمو اغلی جیسے جان نثاروں کی خفیہ سرگرمیاں۔

چنانچہ تحریک مشروطیت کی باگ ڈور" انقلابی کمیٹی" کے ہاتھ میں آگئی۔ اتابک اعظم کے قتل ہونے کے بعد درباری حواس باختہ ہو گئے اور کسی مدت تک مشروطیت کی مخالفت سے باز رہے۔ ایسی صورتِ حال میں انقلابی کمیٹی اور روشن فکر افراد کی سرگرمیوں کے جاری رہنے کے لئے مناسب اور زیادہ اچھے مواقع پیدا ہو گئے۔ یہی سبب تھا کہ یہ کمیٹی ناصر الملک کی کابینہ کو برسرِ اقتدار لائی۔ حالانکہ محمد علی شاہ اس کا مخالف تھا۔

محمد علی شاہ نے اب باقاعدہ کوشش کی کہ اپنے طرفداروں کو قریب تر لے آئے۔ چنانچہ سب سے پہلے امیر بہادر کو (جو مشروطہ کا جانی دشمن تھا) ترقی دے کر سات سو سواروں سمیت آذر بائیجان سے طہران بلا لیا۔ لیکن پارلیمنٹ اس امر پر خاموش رہی اور کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔

اس کے بعد مقتدر نظام اور ضیغم حضرت نے، جو بادشاہ کے خواص میں

شامل تھے، شہر کے بدمعاشوں کو محمد علی بادشاہ کے روپیہ سے جمع کر لیا گیا تھا جو ہر رات پارلیمنٹ کے افراد کو فحش باتیں کہتے، انھیں ڈراتے دھمکاتے اور بادشاہ کا جام صحت نوش کرنے کے لئے شراب پیتے۔ بہت سے فوجی جو سیاسی وجوہات کی بنا پر آذربائیجان بھیجے جانے والے تھے، پارلیمنٹ کی بار بار تاکید کے باوجود بادشاہ نے نہیں بھیجے اور ان کا شہر میں رہنا ضروری سمجھا گیا۔ اس کے برخلاف پارلیمنٹ نے قومی عمارت کی حفاظت کے لئے مسلح گارد مانگی لیکن محمد علی شاہ نے معذوری کا اظہار کیا اور قومی فوج کے افراد ہی قومی عمارت کی حفاظت کرتے رہے۔ اور جب مجلس نے دوسرے شہروں سے قومی مسلح افراد کو بلانا چاہا تو بادشاہ مانع ہوا۔

پارلیمنٹ کو اس امر کا قطعی طور پر علم تھا کہ محمد علی شاہ روسیوں کی ہمدردیاں دن بدن حاصل کر رہا ہے، لیکن وہ اس کا سدِ باب نہ کر سکی۔ اگرچہ اب پارلیمنٹ کی قومی فوج منظم طور پر موجود تھی اور باہر سے بھی امداد طلب کی جا سکتی تھی لیکن پھر بھی سرکاری فوجوں اور ان کے انتظام پر بھروسہ کرتے ہوئے قومی مفاد کے طرفداروں کی عاقلانہ تجاویز کو بھی نظر انداز کیا جاتا رہا۔[۵]

---

۵ چنانچہ بادشاہ نے ہراساں ہو کر ایک مرتبہ پھر علامہ بہبانی اور علامہ طباطبائی کو بلایا۔ ان کی تعظیم تکریم میں (بے حد مبالغہ کیا) پہلے سے زیادہ اہتمام کیا۔ اور اثنائے گفتگو تیسری مرتبہ پھر حلف اٹھا کر کہا۔

" امروز را روزِ اوّل سلطنت من و روزِ اوّل مشروطہ ایران باید پنداشت "

نیک علماء نے اعتبار کیا۔ لیکن محمد علی شاہ نے کبھی ایفائے عہد نہیں کیا۔

ایران میں جرمنی کے اثرات اور انکے سنگین نتائج

روسیوں کی چالاکیوں اور انگریزوں کی چالوں سے اب ایرانی اتنے تنگ آچکے تھے کہ انہوں نے ان ممالک سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا جو ایرانیوں کے ساتھ ان حالات میں ہمدردی رکھتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں طہران میں ایک "جرمنی بنک" کھلا۔ انگریزوں نے ایک مغربی طاقت کو ایران میں اپنے اثرات بڑھاتے ہوئے دیکھا تو فوراً ایران کے ساتھ تمام ہمدردیاں ختم کردیں اور آئندہ جنگ کے پیش نظر ہندوستان میں اپنی شہنشاہیت قائم رکھنے کے لئے اور ایران سے جرمنی اثرات ختم کرنے کے لئے کوششیں شروع کردیں۔ روس بھی ایسے حالات میں خاموش نہ رہا۔ دونوں کے لئے یہ موقع اور بھی یوں اچھا تھا کہ خود ایران میں پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان اب اختلاف نے طبقاتی جنگ کی شکل اختیار کرلی تھی۔ شمال مغربی سرحدوں میں ترکی لشکر گھس آیا تھا، اسی لئے بعض ایرانی سردار بھی ترکوں سے مل گئے۔ ملک میں بدامنی انتہا پر پہنچ چکی تھی۔ ڈاک کا انتظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ خود صوبوں کے حاکم بدمعاشوں کو شہ دے رہے تھے۔

اس کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روس اور برطانیہ نے آپس میں ایک خفیہ معاہدہ کرلیا اور ۳۱ اگست ۱۹۰۷ء کو سینٹ پیٹرس برگ پر دونوں ملکوں کے نمائندوں کے دستخط ہوئے۔

چونکہ اس عہدنامہ کو ایران کے مابعد واقعات سے ایک خاص تعلق ہے اس لئے اس کا مختصر ذکر کردینا ضروری ہے۔

عہد نامہ

اعلیحضرت ملکِ معظم بادشاہ برطانیہ اعظم و آئرلینڈ و جمیع مقبوضات دولتِ برطانیہ و شہنشاہِ ہندوستان اور شہنشاہ سلطنت روس نے آپس میں نیک نیتی کے ساتھ اس معاہدہ کی خواہش ظاہر کی تاکہ مختلف معاملات جو دونوں سلطنتوں کو براعظم ایشیا میں اپنے اپنے مقبوضات کے متعلق پیش آیا کرتے ہیں، اُن میں آئندہ کوئی شکر رنجی یا غلط فہمی نہ واقع ہو۔ اس لئے دونوں شہنشاہوں نے اس کام کے لئے اپنے اپنے سفیر کبیر معیّن کئے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت ملکِ معظم دولت برطانیہ اعظم و آئرلینڈ و جمیع مقبوضات دولتِ برطانیہ و شہنشاہِ ہندوستان نے رائٹ آنریبل سر آرتھر نکلسن جو سلطنتِ روس میں اعلیٰ حضرت کی طرف سے سفیر کبیر تھے اس معاہدہ کی تکمیل کے لئے معین ہوئے۔ اور شہنشاہِ روس کی طرف سے اُن کے دربار کے ایک معزز رکن الیگزنڈر آئی سویس وزیر خارجہ اس کام پر تعینات ہوئے دونوں نے اپنے اختیارات ایک دوسرے پر ظاہر کئے۔

شرائط متعلق ایران

شرط اوّل گورنمنٹ برطانیہ اعظم و گورنمنٹ روس ہر دو اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ایران کی خود مختاری کا لحاظ رکھیں گے۔ دونوں

کی دلی خواہش یہ ہے کہ اس ملک میں امن مسلط ہو نیز تجارت وصنعت وحرفت قائم ہو۔ تاکہ کل اقوام اس سے مساوی فائدہ اٹھا سکیں۔ باین خیال کہ ہر دو سلطنتوں کو جغرافیائی اور تمدنی وجوہ کے لحاظ سے ایران میں صلح اور امن قائم رکھنے میں ایک خاص دلچسپی ہے۔ اس لئے کہ بعض صوبہ جات ملک روس کی سرحد پر واقع ہیں اور بعض افغانستان کی سرحد پر۔ پس باین غرض کہ آئندہ ایران کے ایسے صوبہ جات کے متعلق جو اوپر بیان کیے گئے ہیں ان دونوں سلطنتوں میں کوئی جھگڑا واقع نہ ہو۔ حسب ذیل شرائط منظور کیے گئے۔

(۱) برطانیہ اعظم عہد کرتا ہے کہ جو حد قصر شیریں سے لیکر روس و افغانستان کی سرحد تک قرار دی گئی ہے اور اس کے لئے جو فرضی خط ڈالا گیا ہے اور جو اصفہان یزد اور کاخ سے گذرتا ہوا اس مقام پر جا ملا ہے جہاں روس و افغانستان کے قریب ایران کی حد ختم ہوتی ہے۔ اس حصہ ملک میں نہ اپنے لئے اور نہ اپنی کسی رعایا کے لئے کسی قسم کا پولیٹکل یا تجارتی اجارہ مثل اس کے کہ ریلوں کا بنانا، بنک قائم کرنا، برقی تار لگانا، سڑکوں کے ذرائع بیمہ وغیرہ حاصل نہ کرے گا۔ اور اگر گورنمنٹ روس اس ملک میں اس قسم کے اجارہ حاصل کرے گا تو اس کا مخالف ہوگا۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ مندرجہ بالا مقامات اسی حصہ ملک میں شامل ہیں جہاں دولت برطانیہ اجارہ جات متذکرہ بالا حاصل کرنے سے اپنے تئیں باز رکھیگی۔

شرط دوم دولت روس اپنی طرف سے یہ عہد کرتی ہے کہ جو حد افغانستان سے لے کر بندر عباس تک قرار دی گئی ہے اور اس کے لئے جو فرضی خط ڈالا گیا ہے اور جو گازک، برجند اور کرمان سے گذرتا ہوا بندر عباس

سے جا ملا ہے۔ اس حد میں نہ اپنے لئے اور نہ اپنی کسی رعایا کے لئے نہ کسی تیسری سلطنت کی رعایا کے لئے کسی قسم کا پولٹیکل یا تجارتی اجارہ مثل اس کے ریلوں کا بنانا، بنک قائم کرنا، برقی تاروں کا لگانا، سڑکوں کی تعمیر، نقل و حرکت کے ذرائع بیمہ وغیرہ حاصل نہ کرے گی۔ اور اگر گورنمنٹ برطانیہ اعظم اس ملک میں اس قسم کے اجارہ حاصل کرے گی تو اس کی مخالف ہوگی۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ مندرجہ بالا مقامات اس حصہ ملک میں شامل ہیں جہاں دولتِ روس اجارہ جات متذکرہ بالا حاصل کرنے سے اپنے تئیں باز رکھے گی۔

شرط سوم اب رہا ملک ایران کا وہ حصہ جو ان دونوں حدود متذکرہ بالا کے درمیان ہے۔ وہاں اگر دولتِ برطانیہ کی رعایا کوئی اجارہ حاصل کرے گی تو روس بلا اطلاع و اتفاق دولتِ برطانیہ مانع و مزاحم ہوگا۔ اسی طرح دولتِ برطانیہ اقرار کرتی ہے کہ اس حصہ ملک میں اگر دولتِ روس کی رعایا کوئی اجارہ حاصل کرے گی تو دولتِ برطانیہ بلا اطلاع و اتفاق دولتِ روس مانع و مزاحم ہوگی۔ البتہ جو اجارے اس حصۂ ملک میں موجود ہیں وہ علیٰ حالہ قائم رہیں گے۔

شرط چہارم یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ شاہ کی گورنمنٹ نے اب تک بنک پرس سے جو رقوم قرض لی ہیں اس کے سود کی ادائیگی میں کل چنگی کی آمدنی باستثنائے فارستان و خلیج فارس بیع و مکفول سمجھی جائے گی اور بدستور سابق اس مد میں ادا ہوتی رہے گی اور نیز یہ بھی امر باہمی تسلیم شدہ ہے کہ فارستان اور خلیج فارس کی چنگی کی آمدنی اور نیز سواحل ایران جو بحر کیسپین سے ملحق ہیں وہاں ماہی گیری کی آمدنی اس کے علاوہ پوسٹ آفس اور تار کی آمدنی

حسب دستور سابق اُس قرض کی ادائی میں دی جائے گی جو دولتِ ایران نے اب تک امپریل بنک پرشیا سے قرض لیا ہے۔

شرط پنجم اگر ان قرضوں کی ادائی میں جو اب تک بنک پرس اور امپریل بنک پرشیا سے لئے گئے ہیں کوئی بدمعاملگی یا بے قاعدگی ظاہر ہوگی یا کوئی ایسی وجہ پیش آئے گی جس کے سبب سے اُس کو اختیار ہوگا کہ قرض اول الذکر کی ادائیگی کے لئے آمدنی پر اپنا انتظام قائم کرے یا برطانیہ اعظم کو اسی طرح کے انتظام کی ضرورت پیش آئے تو ہر دو گورنمنٹ اول آپس میں تجویز کرلیں گی کہ کیا سبیل اختیار کرنا چاہیئے تاکہ اس معاہدہ کی رو سے آپس میں کوئی خلاف ورزی نہ ہو۔ اس عہدنامہ کی دوسری شرائط افغانستان اور تبت سے متعلق ہیں۔

یہ عہدنامہ محض روس اور انگلستان نے آپس میں طے کیا اور بظاہر اپنی ذاتی اغراض کے لئے تھا جو ایران اور دوسرے ممالک سے متعلق ہیں۔ دولتِ ایران کو اس معاہدہ کی اطلاع بھی نہ دی اور نہ اُسے کسی طرح پر اس راز میں شریک کیا۔ یہاں تک کہ مجلس کو بھی اس معاہدہ کا علم نہ تھا۔

معاہدہ کا ردعمل ۴ ستمبر ۱۹۰۷ء کو مذکورہ معاہدہ کی خفیہ دفعات کے متعلق اہلِ طہران کو اطلاعات حاصل ہوگئیں۔ معاہدہ کی وہ دفعات یقیناً ایران کی خودمختاری کے خلاف تھیں۔ اس کے نتیجہ میں پارلیمنٹ اور عوام دونوں میں بادشاہ کی طرف سے جذبۂ نفرت اور بڑھ گیا۔ اور پارلیمنٹ کی توجہ عوام کی طرف اور زیادہ ہوگئی۔ انگریزوں کا رویہ اس

معاہدے کے بعد ایرانیوں سے اور بھی بدل گیا۔ پہلے تو ظاہرًا ان کی ہمدردیاں ایرانی عوام کی طرف تھیں بھی، اور وہ پارلیمنٹ کی طرفداری بھی کرتے تھے۔ انگریزی اخبار ایرانی پارلیمنٹ کو "شائستہ حکومتِ ملی" کہتے تھے اور شہنشاہیت کو "غیر قانونی اور استبدادیت پسند" اور روسیوں کو بادشاہ کا طرفدار ہونے کے سبب بُرا بھلا بھی کہتے تھے۔ اس معاہدے کے بعد انگریزی اخبارات کا رویّہ بدل گیا تھا۔ روزنامہ "ٹائمز" نے ایران کے خلاف زبردست مقالے لکھے۔ قومی بینک کی تشکیل کا مذاق اڑایا گیا۔ قومی نمائندوں کو "خام کار" کہا گیا۔ وزیر خارجہ برطانیہ نے ایران کے معاملات میں سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا۔ مجلسِ عوام (انگلستان) نے ایران کے حالات سے بے اعتنائی برتی۔ گویا اس طرح سے انگریز روسیوں سے مل گئے اور انھوں نے روسیوں کی ایران میں چیرہ دستیوں پر اپنی مُہرِ ہمدردی ثبت کر دی۔

نومبر ۱۹۰۷ء ۱۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو بادشاہ بڑے جاہ و حشم کے ساتھ پارلیمنٹ میں آیا اور چوتھی مرتبہ حلف اٹھایا کہ وہ دستوری حکومت کی حمایت کرے گا۔ لیکن دوسری طرف محمد علی شاہ نے پوری طرح یہ کوشش کی کہ خود پارلیمنٹ کے ممبروں میں نا اتفاقی پیدا کر دی جائے۔ چنانچہ وہ اپنے شاہی اثرات کے تحت اس میں ایک حد تک کامیاب ہو گیا جس کے نتائج دو طرح سے ظاہر ہوئے۔

ایک یہ کہ حسب ذیل قومی اخبارات کو بند کر دیا گیا جو پارلیمنٹ کے طرفدار اور بادشاہ کے خلاف تھے۔

(ل) "روح القدس": جس کے آتشیں مقالے نے خود بادشاہ کو سخت ناراض کردیا تھا اور اخبار بند کرکے اس کے مدیر سلطان العلماء خراسانی کو پارلیمنٹ کی طرف سے سخت سزا دی گئی (پارلیمنٹ کو سخت مجبور کردیا گیا تھا کہ وہ اس کے خلاف یہ حکم صادر کرے)

(ب) حبل المتین: جس نے آزادیٔ فکر میں بڑا حصہ لیا تھا۔

اِن اخبارات کے بند ہونے پر شہر میں زبردست ہڑتال ہوئی اور احتجاجی جلسے ہوئے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے مطالبہ کیا کہ حسب ذیل لوگوں کو پارلیمنٹ سے نکال دیا جائے۔

(۱) ملک المتکلمین

(۲) تقی زادہ

(۳) مستشار الدولہ

(۴) سیّد نصر اللہ

(۵) سیّد جمال الدین واعظ

پارلیمنٹ نے اس کا دوسرا مطالبہ منظور نہ کیا۔

بہرحال محمد علی شاہ نے پارلیمانی طرزِ حکومت کو ختم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ایک طرف وہ دن کو پارلیمنٹ کے سامنے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھاتا علماء کو اپنی ہمدردیوں کا یقین دلاتا اور دوسری طرف راتوں کو پارلیمنٹ کو ختم کرنے کی تدبیریں سوچتا، لوگوں کو ہنگامہ و فساد کرنے پر آمادہ کرتا اور شہر کی فضا خراب کرنے کے لئے پروگرام مرتب کرتا۔ یہاں تک کہ دوسرے شہروں کے حکام

کو خفیہ طور پر حکم بھیجا کہ وہ بدامنی پھیلا کر اس کی ذمہ داری پارلیمانی حکومت پر ڈالیں نیز حکومت کے اراکین کو خفیہ طور پر ہدایات دیں کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبران کو پریشان کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ شہر میں بعض مخصوص لوگوں کے پاس روپے رکھ دیئے گئے کہ وہ حکومت کا ہمدرد بنانے کے لئے یہ روپیہ ان میں تقسیم کرتے رہیں تاکہ وہ پارلیمنٹ کے خلاف شہر میں فساد برپا کریں۔

محمد علی شاہ ایک طرف قوم کو اپنی ہمدردی اور اعتماد کا یقین دلاتا رہا۔ لیکن خاموشی کے ساتھ اس نے دو فوجیں تیار کیں۔ ایک فوج قزاق بریگیڈ کے نام سے موسوم تھی جس میں بارہ سے اٹھارہ سو تک ایرانی تھے مگر اُن کے افسر روسی تھے جن کو گورنمنٹ روس نے اس کام کے لئے شاہ کو دیا تھا۔ ان کی تنخواہ بھی ایران کے خزانہ سے دی جاتی تھیں۔ دوسری طرف ایک بے قاعدہ فوج تھی جس میں خود شاہ کے خدمت گار۔ سائیس۔ خچروں والے اور شہر کے اوباش بھی شامل تھے۔

واقعہ میدان توپ خانہ چنانچہ نومبر، دسمبر ۷ء میں شاہ کے اشارے پر سینکڑوں آدمیوں نے میدان توپ خانہ میں زبردست احتجاجی جلسہ کیا اور پارلیمنٹ کے خلاف نعرے لگائے اور مسجد سپہ سالار (جہاں قومی حکومت کے طرفدار جمع ہو کر جلسے کرتے تھے) پر حملہ کردیا اور آپس میں گولیاں بھی چلیں۔

مئی ۱۹۰۸ء یہ مہینہ سخت کشمکش کا مہینہ تھا۔ مجلس کے طرفدار اور بادشاہ اور اس کے درباری دونوں اپنی طاقتوں کو آزما رہے تھے اور اب ایک مرتبہ مجلس کی طاقت کو دیکھتے ہوئے بادشاہ کو جھکنا پڑا اور لے

پایا کہ بادشاہ کے ہواخواہ اور دستوری حکومت کے طرفدار دونوں ایک ساتھ اُس پر عمل کریں۔ چنانچہ یکم جون کو امیر بہادر جنگ اور بعض دوسرے اہلِ دربار کو بادشاہ نے (طوعاً و کرہاً) موقوف کر دیا۔ امیر بہادر جنگ نے روسی سفارتخانہ میں پناہ لی۔

اگلے ہی دن سے روس اور برطانیہ نے علانیہ مداخلت شروع کر دی۔ سفیر روس اور سفیر برطانیہ دونوں وزیر امور خارجہ ایران کے پاس آئے کہ وہ بادشاہ کے منصوبوں اور خواہشوں کی مخالفت سے باز نہ آئیں گے تو گورنمنٹ روس دخل دے گی۔ روسی سفیر نے اس معاملہ میں پیش قدمی کی اور سفیر برطانیہ نے اس میں ہاں میں ہاں ملائی۔

مجلس کی قوت اب بڑھ گئی تھی اور محمد علی شاہ کو مجبور کر کے قانون کا پابند بنانے پر عوام میں جذبۂ وطن اور زیادہ پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن مذکورہ بالا دونوں سلطنتوں کے مفاد اسی میں تھے کہ مجلس کو کمزور رکھا جائے (اگرچہ روس اپنے حریف برطانیہ کو اس معاملہ میں بھی زک دینے کی فکر میں تھا، جیسا کہ آئندہ واقعات سے معلوم ہوگا اور اس کی قوی کوشش یہی تھی کہ قرض دے دے کر سلطنت ایران کو گروی رکھ لیا جائے اور اس طرح وہ روس کا ایک صوبہ بن جائے اور میں کلیتہً مختار بن جاؤں۔

۲ر جون ۱۹۰۸ء کو بہرحال بادشاہ نے ڈر کے باعث شہر چھوڑ دیا اور شہر کے باہر باغ شاہ میں رہنا اختیار کیا۔ شہر سے روانگی کے وقت شاہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ جن راستوں سے گزر ہوگا وہاں کوئی

مزاحم نہ ہو۔ لہٰذا حفظِ ماتقدم کے لئے دو ہزار گارڈ کے سپاہی اور تین سو توپ خانے کے جوانوں کو مع توپ کے حکم دیا کہ شہر میں خوب ہنگامہ بپا کریں اِدھر یہ ہنگامہ شروع ہوا اُدھر شاہ چپکے سے کرنل لیاخوف کو ساتھ لے کر باغ شاہ کو چل دیا۔

دوسرے دن اہلِ تہران نے یہ سمجھ لیا کہ اب بادشاہ کی نیت میں فرق آگیا ہے اور مجلس پر حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔ لہٰذا ایک گروہِ کثیر میدانِ بہارستان میں جمع ہوا اور محمد شاہ کی معزولی کے طالب ہوئے۔

۵ رجون ۱۹۰۸ء

شاہ نے دستوری حکومت کے بہت سے اراکین کو مشورہ کرنے کے بہانے سے باغ شاہ میں بلایا اور جب وہ وہاں آئے تو ان کو قید کر لیا۔ اُن میں سے ایک شخص کسی طور سے بچ کر نکل گیا۔ اور اُس نے فوراً مجلس کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ اس خبر سے تمام شہر میں ہلچل مچ گئی۔

طہران اور فوجی حکومت

۶ رجون ۸ء کو محمد علی شاہ نے "لیاخف" روسی افسر کو طہران کا فوجی گورنر مقرر کیا اور شہر اُس کے حوالے کر دیا۔ لیاخف نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ حکم جاری کیا کہ۔ "غیر فوجی لوگوں سے اسلحہ چھین لئے جائیں۔" کرفیو آرڈر لگا دیا گیا اور اجتماعات کو ممنوع قرار دیا گیا۔

اُدھر بادشاہ نے مجلس میں نفاق پیدا کرنے کے لئے اپنے چند خاص لوگوں کو مقرر کر دیا کہ وہ مجلس کے نمائندوں سے گفتگو جاری رکھیں، تاکہ مجلس شاہ

پروگرام سے ناواقف رہے۔ چنانچہ صنیع الدولہ، مشیر الدولہ، موتمن الملک مجلس
کے نمائندوں سے اس طرح گفتگو کرتے رہے کہ بادشاہ گویا صلح کے لئے
رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجلس کے مذکورہ نمائندے اس خوش فہمی میں
مبتلا ہو گئے کہ وہ بادشاہ اور ملت کے درمیان واسطہ ہیں، اور مجلس ہی ملت
اور بادشاہ کے درمیان صلح کرانے کا ماحول پیدا کر رہی ہے۔
یہاں تک کہ جو تار باہر سے مجلس کی ہمدردی میں آرہے تھے اور جن کی
تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی، ان کو مجلس میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی،
یہاں تک کہ ان کو پڑھ کر بھی نہیں سنایا گیا۔ تبریز سے لوگ پارلیمنٹ کی مدد
کرنے کے لئے تیار تھے لیکن اُن کی خدمات سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور
پارلیمنٹ کے ارکان اسی خیال میں رہے کہ بادشاہ مجبور ہو کر مجلس کی مخالفت
ترک کر دے گا۔

حالانکہ بادشاہ فوجی تیاریوں میں مصروف تھا۔ یہاں تک کہ تمام فوجی سامان
باغ شاہ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ شہر کے تمام حصوں میں توپیں لگا دی گئی تھیں۔
آخر کار ۱۲ جون ۱۹۰۸ء محمد علی شاہ نے اپنی حالت مستحکم کرنے کے
بعد مجلس کو الٹی میٹم دیا کہ حسب ذیل چار آدمیوں کو فوراً ملک سے نکال دیا
جائے اور حکومت ان کے تمام اخراجات برداشت کرے گی۔

(۱) ملک المتکلمین

(۲) مرزا جہانگیر خان

(۳) سید محمد رضا مساوات

(۴) سید جمال الدین واعظ

مجلس نے غضبناک ہو کر بادشاہ کا یہ مطالبہ رد کر دیا۔ اسی رات کو با
کے حکم سے میرزا سلیمان میکدہ (ایک مشہور طرفدار مشروطہ) کے گھر پر حملہ کر
اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس لئے مجلس نے احتیاطی طور پر خاص خاص لو
کے مکان پر پہرے لگا دیئے۔ البتہ اب فیصلہ کیا گیا کہ ایسے لوگوں کے
مجلس ہی میں قیام کرنا زیادہ بہتر ہے جن کی جانیں زیادہ خطرے میں ہیں
پارلیمنٹ کی عمارت میں رہ جائیں۔ چنانچہ حسب ذیل افراد پارلیمنٹ
رہ گئے۔

(۱) ملک المتکلمین

(۲) سید جمال الدین واعظ

(۳) شیخ علی قاضی قزوینی

(۴) سید محمد رضا مساوات۔ مدیر "مساوات"

(۵) میرزا محسن نجم آبادی۔

(۶) میرزا جہانگیر خان۔ مدیر "صورِ اسرافیل"

(۷) سید جلیل اردبیلی۔

(۸) مرزا داؤد خان۔ مدیر "الصنائع"

(۹) مرزا محمد خراسانی۔ مدیر "حقوق"

(۱۰) اسد اللہ

(۱۱) ابوالفتح زادہ۔

(۱۲) بہاءُ الواعظین
(۱۳) میرزا قاسم خان۔ مدیر "صورِ اسرافیل"
(۱۴) محمد علی ملک زادہ
(۱۵) میرزا علی اکبر خان ارادتی (برادرِ قاضی قزوینی)

اب شہر میں سرکاری فوجوں کے حملہ کی خبریں گرم ہو چکی تھیں اور بڑی سیڑھیاں تیار کی جا رہی تھیں کہ ان کے ذریعہ سے مکانوں میں اتر جائے اس لئے شہر میں دہشت کا دور دورہ تھا۔ اسی لئے اس نے "لیاخف" روسی افسر کو تہران کی فوجوں کا حاکم بنا کر شہر اُس کے حوالے کر دیا۔

لیاخف نے سب سے پہلے یہ حکم جاری کیا کہ غیر فوجی لوگوں سے اسلحہ چھین لئے جائیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ کرفیو آرڈر لگا دیا گیا۔ تمام فوجی سامان باغ شاہ میں منتقل کر دیا گیا۔

دوسری طرف بادشاہ کے خاص آدمی مجلس (پارلیمنٹ) کے نمائندوں سے گفتگو بھی کرتے رہے تاکہ شاہ کے پروگرام کی اطلاع نہ مل سکے اور شاہ کے نمائندے اس طرح سرگرمِ گفتگو رہے گویا وہ صلح کے لئے آمادہ ہیں۔ چنانچہ پارلیمنٹ کے نمائندے تقریباً مطمئن ہو گئے تھے اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ گویا ہم قوم اور بادشاہ کے درمیان صلح کے پیامبر ہیں۔

طہران سے باہر دوسرے شہروں میں بادشاہ پر عدم اعتماد ظاہر کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں تار پر تار آ رہے تھے جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی یہاں تک کہ لوگ تبریز سے بھی آنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن مصالحت کی گفتگو

نے ایسا پردہ ڈالا کہ پارلیمنٹ اپنی امداد کے لئے باہر سے افراد نہ بلا سکی، بلکہ بادشاہ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے مجلس نے ملک المتکلمین اور سید جمال الدین واعظ کو یہ رائے دی کہ وہ اپنی تقاریر بھی بند کر دیں نیز روز نامۂ صور اسرافیل اور روز نامۂ مساوات بھی بند کر دیا جائے جس کے نتیجہ میں عوام میں جوش و خروش کا جذبہ ختم ہو گیا۔ ان میں مایوسی پھیل گئی۔ بہت سے ممبرانِ انجمن متفرق ہو گئے۔ بعض مجاہدین نے تہران چھوڑ دیا۔ نتیجے کے طور پر مقابلہ کی آگ بجھ گئی۔

اکثر ڈرپوک (وکلائے مجلس) ممبرانِ پارلیمنٹ (جن میں سے مرزا لطف علی، حاجی اسمٰعیل، میرزا اصفہانی قابلِ ذکر ہیں) نے صلح و صفائی کے خیال سے بعض مجاہدین سے اسلحہ لیکر چھپا دیا۔ اس طرح مجلس میں سے جمع شدہ ہتھیار غائب کر دیئے گئے۔ ان سب باتوں کے نتیجہ میں پارلیمنٹ عملی طور پر کمزور ہو گئی اور ظاہری طور پر (مشروطہ) دستوری حکومت کے موافقین اب بادشاہ کے جاسوس بنکر اپنا کام پورا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے ایسی دہشت پھیلائی کہ سوائے حاجی میرزا ابراہیم تقی زادہ کے کوئی جنگ کا طرفدار نہ تھا۔ یہاں تک کہ جنگ کے دن سوائے تین چار پارلیمنٹ کے ممبران کے باقی سب غائب ہو گئے۔ اسی دن وزراء پارلیمنٹ میں آئے اور بادشاہ کی طرف سے حسب ذیل مطالبات پیش کر دیئے۔

(۱) وزراء بادشاہ کے سامنے جوابدہ ہوں اور مجلس کو ان کے معزول کرنے کا کوئی اختیار نہ ہو۔

(۲) بادشاہ کو دس ہزار مسلح فوج تہران میں رکھنے کا حق حاصل ہو۔

(۳) فوج بادشاہ کے قبضہ میں ہو اور وزیر جنگ بادشاہ کے سامنے جوابدہ ہو۔

مجلس نے بادشاہ کی ان تینوں شرطوں کو رد کر دیا۔ اور اب بادشاہ کو گویا پوری آزادی مل گئی کہ قوم کے خون سے کھیل کھیلے۔ تمام راستوں پر پہرے لگا دیئے گئے تاکہ لوگ میدانِ بہارستان میں جمع نہ ہو سکیں۔

شہر کی حالت

اب فوجی دستے شہر میں پھر رہے تھے جس کے ہاتھ میں اسلحہ دیکھتے چھین لیتے۔ اسی دن بعض تاجر اور ہمدرد مجلس بڑی مشکل سے مجلس میں آئے۔ انہوں نے کہا کہ تمام بازار اور گلیاں بند ہیں۔ آدمی پریشان ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم سب مسجد سپہ سالار میں متحصن ہو جائیں۔ لیکن منافق ارکانِ مجلس نے ان کی بات نہیں مانی۔ بڑی مشکل سے اس بات پر راضی ہوئے کہ اگر جمع ہوں تو ان کے پاس کوئی اسلحہ نہ ہو۔ چنانچہ علامہ بہبہانی نے شدید طور پر اس طرح نہتے جمع ہونے کی مخالفت لیکن ان کی ایک نہ چلی۔

بادشاہ نے (۲۲ر جون ۱۹۰۸ء) درباریوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں کے افراد کو مجلس سے دور کسی اور مقام پر منتقل کر دیں۔

آغازِ جنگ (فوجی حکومت)

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

آخر کار شہر کے شمالی حصہ میں بادشاہ روسی افسروں کے ساتھ بیس ہزار سپاہی لئے ہوئے اپنی قوم کے خونِ ناحق بہانے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ ملک میں رعایا کی خوشحالی اور فارغ البالی کے وسائل پر غور کرنے کی بجائے قوم کے خون کی ندیاں بہانے پر تل گیا۔ گو خونِ ناحق کا

تصور بار بار اُس کو اس امر سے باز رکھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن غیر ملکی دوست جو اپنے مفاد کو اس کی تباہی میں مضمر دیکھتے تھے، اُس کی عقل کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُس کے ہاتھ میں تلوار دے چکے تھے اور خود اس کا بازو پکڑ کر اس کی رہبری کر رہے تھے۔ لہٰذا اُس نے یہ طے کر لیا کہ "تخت یا تختہ"

جنگ سے ایک رات قبل اسی مضمون پر مشتمل ایک خط اس نے کامران مرزا نائب السلطنۃ کو لکھا جس میں اس نے واضح طور سے اس امر کا اظہار کیا کہ "مثل نادر یا بادشاہی کنم یا سر میدہم۔ جواب بعضی مطالب فردا۔"

چنانچہ رات کو قصر قاچار پر ایک توپ پارلیمنٹ کو منہدم کرنے کے لئے لگا دی گئی اور میدان سپہ میں بھی خندقیں کھود کر توپیں لگا دی گئیں جن کا رُخ مجلس کی طرف کر دیا گیا۔

دوسری طرف ۲۱ر جون ۱۹۰۸ء کو تقی زادہ سردار معظم خراسانی، تیمور تاش اور ابوالفتح زادہ اور مرزا صالح (سابق حاکم طہران جو بادشاہ سے بددل ہو کر قومی راہنماؤں میں شامل ہو گیا تھا) قومی دفاع کے لئے مسجد سپہ سالار میں پہنچ گئے اور مجاہدین کے ساتھ پناہ گاہیں اور دفاعی دیوار بنانے میں مصروف ہو گئے۔ مسجد سپہ سالار میں مورچے قائم کر لئے گئے۔

۲۲ر جون ۱۹۰۸ء کو دن میں چھ سو سے زیادہ افراد مجلس کی حفاظت کے لئے موجود تھے۔ لیکن رات کو چند افراد کے سوائے باقی سب چلے گئے۔ صبح کو جب فوج نے سب راستے بند کر دیئے تو وہ پارلیمنٹ کی حفاظت کے لئے وہاں نہ پہنچ سکے۔

محمد علی شاہ کی کیفیت

محمد علی شاہ کو اپنی فتح پر اطمینان ضرور تھا۔ مقابلہ کے لئے غیر معمولی فوج تھی اور غیر معمولی انتظامات بھی۔ چاروں طرف جاسوس بھی پھیلے ہوئے تھے۔ جو پل پل کی خبر دے رہے تھے اور اس کے دل کو مضبوط کرنے کی پیہم کوشش کر رہے تھے، لیکن وہ غیر معمولی طور پر پریشان تھا۔ سواری کی خاص گاڑی کو حکم تھا کہ چلنے کے لئے فوراً تیار رہے۔ تمام جواہرات جمع کر لئے گئے تھے۔ تقریباً بیس مرتبہ اندر سے باہر اور باہر سے اندر آیا اور گیا۔ بار بار کاسک بریگیڈ کے افسروں کی ہمت افزائی کرتا رہا یہاں تک کہ خود کئی مرتبہ روسی سفیر سے ٹیلیفون پر جا کر گفتگو کی۔

جنگ

ابھی آفتاب طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ تمام راستے بند کر دیئے گئے تمام سوار، پیادے پارلیمنٹ کے میدان کی طرف چل دیئے۔ مجلس کی محافظت کے لئے تھوڑے سے آدمی موجود تھے۔ جن میں انجمن آذربائیجان اور انجمن منظفری کے مجاہد شامل تھے اور جنہوں نے مورچے بنا رکھے تھے۔

۲۳ جون ۱۹۰۸ء

کو صبح ہوتے ہی جنگ کا آغاز ہوا۔ توپوں کی آوازوں سے شہر گونج اٹھا۔ بعض لوگ اگر پارلیمنٹ کی طرف دوڑے بھی تو خالی ہاتھ آخر کیا کرتے۔ مجاہدین کے پاس اسلحہ زیادہ نہ تھا۔ کہاں تک لڑتے۔ "لیاخف" آیا اور اس نے خود کھڑے ہو کر پارلیمنٹ کو اڑانے کا حکم دیدیا۔ توپوں کا چلنا تھا کہ شہر کی دیواریں ہل گئیں۔ سپاہیوں کی گولیاں ہر طرف چلنے لگیں اور لوگوں کے سروں پر سے گذرنے لگیں تھوڑی دیر میں پارلیمنٹ کی عمارت منہدم ہو گئی اور سرکاری فوج

نے اس پر قبضہ کر لیا۔

جب دونوں انجمنوں (انجمن مظفری، انجمن آذر بائیجان) کے اراکین کو معلوم ہوا کہ مجلس پر سرکاری فوجوں کا قبضہ ہو گیا ہے تو ناچار اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے ہٹ گئے اور جو بیچارے اپنی غیرت اور جوشِ ملّی کے سبب موجود رہے انہوں نے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیا جن میں حاجی میرزا ابراہیم آقا خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سرکاری فوجیں پارلیمنٹ میں داخل ہو گئیں۔ تمام قیمتی سامان لوٹ لیا۔ ایسی حالت میں باقی بچے ہوئے چند قومی سرداروں نے یہ مناسب سمجھا کہ پارلیمنٹ کی شمالی دیوار کو توڑ کر امین الدولہ پارک میں پہنچ جائیں۔ چنانچہ یہ سب اُس دیوار کو توڑ کر پارک میں پہنچ گئے۔

امین الدولہ نے گو اندر اپنے مکان میں چھپ جانے کے لئے کہا۔ لیکن یہ لوگ پارک سے نکل کر قریب ہی ایک ناتمام مکان میں چلے گئے۔ اُس نے باہر سے تالا لگا دیا اور فوراً بادشاہ کو خبر پہنچائی۔ چنانچہ اس مقام سے حسب ذیل آدمیوں کو گرفتار کیا گیا۔

(۱) ملک المتکلمین (۲) بہاء الواعظین (۳) محمد علی ملک زادہ
(۴) شیخ علی قاضی قزوینی (۵) میرزا قاسم خان (۶) میرزا داؤد خان
(۷) میرزا جہانگیر خان (۸) میرزا علی اکبر خان اراقی

آزادی کے رہبروں میں سے علامہ طبا طبائی۔ علامہ بہبانی اور شاہزادہ ناصر الملک کو دوسری جگہ سے گرفتار کیا گیا۔

سپاہیوں نے جس ذلت اور خواری کے ساتھ اُن کو پکڑا، اور جو بے عزّتی کی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ علّامہ بہبانی کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور سفید داڑھی خون میں لال ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ جب ان گرفتار شدگان کو بادشاہ کے حکم کے مطابق باغ شاہ میں لے گئے تو وہاں جو بھی ظلم وستم ان پر روا رکھے گئے وہ ناقابلِ تحریر ہیں۔

مختصر یہ کہ ان قومی سرداروں کو درخت کے ساتھ زنجیروں میں باندھ دیا گیا۔ تمام دن جلتی ہوئی دھوپ میں یہ سب لوگ ننگے کھڑے رہے، اور رات کو بھی ایک زنجیر میں سب قیدی جکڑے ہوئے تھے اور اس پر سختی یہ کہ بولنے کا حکم نہ تھا۔ اگلی صبح کو ملک المتکلمین اور مرزا جہانگیر خان کی پیشی ہوئی اور بادشاہ نے دونوں کو رسّی سے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔

بقیہ افراد پر فردِ جرم عاید کر کے سزا دینے کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوا جس کے صدر شاہزادہ محمد حسین موید السلطنۃ تھے۔ اور حسب ذیل لوگوں کو کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا۔

(۱) آغا میرزا محمد علی خان ملک زادہ (پسر ملک المتکلمین) ان سے کوئی بات معلوم نہ ہو سکی تو رخصت کر دیا گیا۔

(۲) آقائی سید یعقوب شیرازی۔

(۳) حسین خان

(۴) آقائی ارادتی (برادر قاضی قزوینی)

کمیشن مقرر ہونے کی خاص وجہ یہ تھی کہ سفیر انگلستان نے خود بادشاہ سے

اس بے پناہ ظلم اور خونریزی کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا خصوصاً ملک المتکلمین اور میرزا جہانگیر خان کے ساتھ اس قسم کی سخت سزا دینے پر اظہار ناپسندیدگی کیا۔ بادشاہ کو اس نے بتایا کہ اس قسم کی سزائیں تو قرونِ وسطیٰ میں دی جاتی تھیں اور بیسویں صدی ان سزاؤں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

حصّہ دوم

باب پنجم (۵)

بعض مخصوص شہداء

سرآغاز دُنیا کے مختلف ممالک میں ایسے انسان وجود میں آتے رہے ہیں جو اپنی عقل اور فراست کے اعتبار سے عام انسانوں سے بلند تر ہو کر حقائق عالم کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے نفسانی خواہشات کو ترک کیا اور علم و دانش کی درجہ سے حقیقت اور کمال کو پہنچے۔ انہوں نے نوعِ انسانی کی ہدایت کا دیا ہاتھ میں لیا اور جہالت کی تاریکی میں نوعِ انسانی کی رہنمائی کی۔

ایسے لوگ حقیقت میں مللِ عالم کے پیشوا اور نوعِ انسانی کے رہنما ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کا ظہور ایسے مواقع پر ہوا ہے جبکہ ممالک عالم میں بے دینی اور بے ایمانی کا زور ہوا۔ فسادِ اخلاق نے اخلاقِ حسنہ پر غلبہ پایا۔ حکامِ وقت کے مظالم سے حیاتِ اجتماعی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ ظلم و ستم نے حق و انصاف کی جگہ

لی اور تاریکی نور پر چھا گئی۔

حقیقت میں ایسے انسان اپنی اپنی قوموں کو مذکورہ مصائب سے نجات دلانے کے لئے وجود میں آئے ہیں اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ حصولِ مقاصد میں انہوں نے اپنی جانیں بھی قربان کر دی ہیں۔ حقیقت میں وہی لوگ انسانی سعادت و ترقی کو وجود میں لانے والے ہیں اور ملل کی آزادی اور ترقی ایسے ہی راہنماؤں اور بڑے لوگوں کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ قومیں صدیوں تک جہالت اور نادانی میں زندگی گزارتی رہیں اور صدیوں کے بعد ایک رہنما اور نوعِ انسانی کا سچا دوست ان میں پیدا ہوا، جس نے اپنی جان کو قربان کر کے جہالت اور نادانی کے پردے کو چاک کیا اور اپنی قوم کو سعادت اور خوش بختی کی منزل پر پہنچایا۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ بعض اقوام صدیوں تک مطلق العنان حکمرانوں کے ظلم و ستم کا شکار رہی ہیں۔ لیکن جب ان کی قسمت کا ستارہ چمکا ہے تو خود اُن ہی میں سے بعض لوگ ایسے وجود میں آئے جنہوں نے اپنی جانوں کی قربانیوں سے قوم کو ستم کاروں کے مظالم سے نجات دلائی۔

اس لئے یہ امر یقینی ہے کہ ایسے لوگ خداوند تعالیٰ کی جانب سے ایک بہت بڑی نعمت ہیں جو اُس کے بندوں کو عطا ہوتی ہے۔

یونان کے ایک بڑے فلسفی نے کہا ہے" اکثر اوقات مللِ عالم کے درمیان ایسے بڑے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو علم و دانش سے دُنیا کو روشن کرتے ہیں اور لوگوں کے سینوں میں آزادی، فضیلت اور تقویٰ کے بیج بو کر اُن کو اشرار

کے شر سے بچاتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ نوعِ بشر کی خدمت کے عوض اپنے پیچھے ہمیشہ کے لئے اپنا نام چھوڑ جاتے ہیں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ دنیا کے بڑے لوگوں میں ایسے لوگوں کا مرتبہ بہت بلند ہے جنہوں نے مللِ عالم کو استبداد کی غلامی اور ظلم کی قید سے رہائی دی۔ اور ان کی آزادی کا ذریعہ بنے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کا مرتبہ دنیا کے بڑے لوگوں میں بہت بلند ہے۔ اس لئے کہ جب تک کوئی ملّت، آزادی کی نعمت سے بہرہ مند نہیں اور اُس کے افراد ایک آزاد ماحول میں پرورش نہیں پاتے تو یہ امر محال ہے کہ وہ ملّت ترقی اور تمدّن کا راستہ اختیار کرے اور انسانیت کے بلند مقام پر پہنچے۔

دُنیا کے بڑے لوگوں نے جب آزادی کے ماحول میں زندگی گزاری تو اُن کی بدولت اُن کی قوم نے ترقی کی منزلیں سرعت سے طے کیں اور علم و تمدن کی عظیم الشان عمارت کو تعمیر کیا۔

انقلاب مشروطیت ایران کے ہیرو ملک المتکلمین "آزادی" کے متعلق فرماتے ہیں۔

"ہر شخص اپنے خدا کی تعریف اُس کی متعدد صفات میں سے ایک صفت کی وجہ سے کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی صفت عین ذات ہے۔ میں اپنے پروردگار کی پرستش اس کے مظہر آزادی ہونے کی صورت میں کرتا ہوں اور اس امر کا یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت جو اُس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے، آزادی ہے۔ اس لئے

کہ انسان بغیر آزادی کے اپنے مقصود کی آخری منزل تک، جو خداشناسی ہے، نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی وہ زندگی اور وجود کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے اور نہ دنیا و آخرت میں رہائی پا سکتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ میں بغیر کسی شک اور تمہید کے کہتا ہوں کہ آزادی کے بلند مقام پر پہنچنے اور آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہونے کے بغیر انسان دنیا میں حکمت اور عدل کو نہیں پھیلا سکتا اور نہ ہی وہ انسانیت کے بلند ترین مقام پر پہنچ سکتا ہے۔

آزادی انسان کا انتہائی مقصد ہے۔ آزادی، نیکی اور زیبائی کا مظہر ہے۔ عدالت اور انسانیت کا محل آزادی کی بنیاد کے سوا کسی چیز پر تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ تمدن کا درخت آزادی کی روشنی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔ ظلم و ستم کی جڑیں آزادی کے تیشہ کے بغیر نہیں کاٹی جا سکتیں۔ اور حکمت و فلسفہ کا بیج آزادی کی زمین کے بغیر نہیں بویا جا سکتا۔

ایسے انسان بغیر آزاد ماحول کے پرورش نہیں پا سکتے، جن کی صفت نیکی اور تقویٰ ہے۔ انسانیت کے بنیادی حقوق آزادی کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتے، قوموں کی شرافت اور انسانیت بغیر آزادی کے سایہ کے باقی نہیں رہ سکتی۔ قومی شان کی حفاظت اور خاندانی وقار کی بقا آزادی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ انفرادی اور اجتماعی قومیت اور حیثیت کا مرتبہ ظلم و تعدی سے پاک زندگی اور حقیقی عظمت اور سربلندی آزادی کے ماحول کے بغیر میسّر نہیں ہو سکتی۔"

مذکورہ بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام سیاسی، اجتماعی اور تمدّنی اصلاحات کی بنیاد آزادی ہے۔ آزادی ہی انسان کی انتہائی آرزو ہے۔ جب تک کوئی قوم آزادی کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہوتی، وہ تہذیب و تمدّن کے صحیح مقام پر نہیں پہنچ سکتی۔ اور اس کا شمار دنیا کی زندہ اقوام میں نہیں ہو سکتا۔

حیاتِ انسانی کا یہی وہ فلسفہ تھا اور انسانی زندگی سے متعلق یہی وہ حقیقت تھی، جس نے ہم کو مجبور کیا کہ ہم اس باب میں ایران کے ایسے لوگوں کی زندگی کے حالات اور اُن کے کارناموں کو پیش کریں، جنہوں نے ایران کی دو ہزار چھ سو سالہ استبدادی حکومت کو ختم کرنے کے لئے اپنی جانیں قربان کیں اور اپنی قوم کے لئے حقیقی آزادی کا سرمایہ فراہم کیا۔

حاجی میرزا نصراللہ ملک المتکلمین اصفہانی

نام میرزا نصراللہ ، ملک المتکلمین لقب ۔ والد کا نام مرزا محسن بہشتی تھا۔

پیدائش جنوری ۱۸۶۱ء میں اصفہان میں پیدا ہوئے ۔

تعلیم ابتدائی تعلیم اصفہان میں حاصل کی۔ فلسفہ اور منطق میں ملّا صالح فریدنی سے جو اپنے زمانے کے نامور عالم تھے، پڑھی۔

ایامِ جوانی ۱۸۸۳ء میں بائیس سال کی عمر میں مکّہ پہنچ کر حجِ بیت اللہ سے مشرّف ہوئے۔ واپسی پر بمبئی گئے اور وہاں پر دو سال کا عرصہ فلسفہ اور افکارِ جدید کے مطالعہ میں صرف کیا اور جدید فارسی کے لئے ایک مدرسہ بھی بمبئی میں کھولا۔ بمبئی کے قیام کے دوران میں ایک کتاب "من الخلق الی الحق" اسمٰعیلیوں کے خلاف لکھی جس پر بمبئی سے خارج البلد کر دیئے گئے۔

۱۸۸۶ء میں بمبئی سے واپسی کے بعد سید جمال الدین افغانی سے بوشہر میں ملاقات کی اور تین مہینے تک ان کے علم و فضل سے استفادہ کیا اور اسی ضمن میں اصولِ تمدن اور آزادی سیکھے اس کے بعد اصفہان واپس ہوئے۔

تھوڑے ہی عرصہ میں علم و فضل میں اُن کی شہرت اصفہان میں پھیل گئی اور مئی و جون ۱۸۸۶ء میں (رمضان کے زمانے میں) مسجد جامع اصفہان میں ان کی تقریریں ہوئیں۔ حالانکہ اس زمانے میں تقریروں پر پابندی تھی لیکن آزادی کی آگ جو اُن کے دل میں روشن ہو چکی تھی اس کے باعث انہوں نے کسی کی پرواہ

کے بغیر سطحی علماء اور حکومت کی سختیوں کے خلاف پر زور تقریریں کیں۔ اپنی تقریروں میں آزاد دنیا کی ترقیوں اور قانون وعدالت کی خوبیوں اور جدید علم کی برکتوں پر روشنی ڈالی۔ اس قسم کی باتیں لوگوں نے اس سے قبل نہیں سنی تھیں اور اس شہر کے آدمی ایسے بیانات کے پیاسے تھے، لہذا ہزاروں آدمی جوق در جوق ان کی تقریروں میں شرکت کرتے تھے۔

ابھی رمضان ختم نہیں ہوا تھا کہ اُن کی اِن تقریروں کی وجہ سے شہر میں تہلکہ مچ گیا اور بعض لوگوں نے ان کو فاسد الخیال کہنا شروع کر دیا۔ یہ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے شہر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔

انہی دنوں میں تبریز کے باشندوں نے، جو آزادی کے علمبرداروں میں سے تھے، ان کو تبریز بلایا۔

ترک شہر

چنانچہ روانگی سے قبل انہوں نے دیوانِ حافظ سے فال نکالی تو یہ اشعار نکلے۔

ما آزمودہ ایم دریں شہر بختِ خویش
باید بروں کشید ازیں ورطہ رختِ خویش

ملک المتکلمین اصفہان سے تبریز چلے گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہاں کے باشندے اُن کی اس نئے رنگ کی تقریروں پر فریفتہ ہو گئے۔ چنانچہ وہ چند سال تبریز میں مقیم رہے۔

سید جمال الدین افغانی کی شخصیت اور ایران میں استبدادی حکومت کے مظالم نے ان کے دل و دماغ پر بہت اثر ڈالا تھا۔ اس لئے ان کا بہت

سا وقت اپنے وطن کو ناساز گار حالات سے بچانے کے متعلق سوچنے میں
ہوتا رہا۔ اور چونکہ وہ خطابت میں بے مثل تھے، اس لئے اپنی تقریروں
ان تاثرات کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

انہوں نے تبریز آنے کے بعد یہاں کے حالات کا مطالعہ کیا۔ محمد علی
ولیعہد حاکم آذربائیجان تھا۔ وہ ایک سخت اور ظالم حاکم تھا۔ آذربائیجا
کے باشندے اس سے تنگ تھے لیکن وہ اپنی حکمت عملی کے سبب بڑا
آذربائیجان کے آزادی خواہ علماء کے ساتھ تھا۔ اس زمانے میں عین ال
وزیر اعظم تھا اور اس کی خواہش تھی کہ بجائے محمد علی میرزا کے سالار الدول
ولیعہد ہو جائے۔ محمد علی میرزا کو یہ اطلاعات ملیں تو اس نے کچھ روپیہ علماء
طہران کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے بھیجا۔ اُدھر ملک المتکلمین نے جب
دیکھا تو انہوں نے بھی یہ رائے قائم کی کہ بجائے محمد علی کے سالار الدول
کی ولیعہدی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ خود سالار الدولہ بھی جو ان دنوں کردستا
کا گورنر تھا، یہی خواہش دل میں لئے ہوئے تھا۔ چنانچہ ملک المتکلمین اسی مقص
کے لئے آذربائیجان سے کردستان گئے۔

سالار الدولہ، مظفر الدین شاہ کا تیسرا بیٹا تھا، وہ بہت مغرور اور سرکش
اور اس امر کا منتظر تھا کہ وقت ملنے پر فوراً علمِ بغاوت بلند کر دے۔ اس نے
بہت سے سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ نصیر الملک شیرازی اس کا
اور پیش کار تھا۔ سالار الدولہ پہلے فارس کا حاکم تھا اور بعد میں یہ کردستان کا
حاکم ہوا تھا۔ چنانچہ نصیر الملک شیرازی نے شیراز میں ملک المتکلمین کی

سالارالدولہ سے کرائی تھی۔ ملک المتکلمین کی شیریں بیانی نے اُس کو مسخر کیا کہ وہ مغرور ہونے کے باوجود اُن کے ہاتھ میں بالکل موم تھا۔

ملک المتکلمین نے سالارالدولہ کو اس امر پر تیار کر لیا تھا کہ وہ بادشاہت حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے پارلیمنٹری حکومت ملک میں رائج کرے گا۔

ملک المتکلمین واپس طہران آکر آزادی چاہنے والوں سے مل گئے۔ اور سالارالدولہ کی ولیعہدی کا خیال اُن کے دل سے نکل گیا۔ اس لیئے کہ اصولاً وہ بادشاہت کو ظلم کی بنیاد سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں سالارالدولہ ہو یا محمد علی میرزا، دونوں ایک ہی شطرنج کے مہرے تھے، جن کا آخری مقصد رعایا کو غلام بنانا اور ان کے حقوق سلب کرنا تھا۔

اُن کی ایک تقریر کے چند جملے قابل توجہ ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۴ء میں کی جن سے اُن کے عزم صمیم اور استقامتِ رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔

"بھائیو! اب وقت تنگ ہے، دشمن گھات میں ہے۔ ہم نے اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر ایران کی محافظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم جلد از جلد اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے کام میں مشغول ہو جائیں اور اپنی سوئی ہوئی تمناؤں کو جگانے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے اگر اپنی جانوں کی قربانی بھی دینی پڑے تو ہم اپنے مستحکم ارادوں کی بنا پر اس سے بھی دریغ نہیں کریں اور اپنی تمام تر توجہ اپنے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے میں صرف کریں۔ ہم اپنی زندگی میں اس نتیجہ پر

پہنچے ہیں کہ جس قدر انسان میں قوتِ ایمان کے ساتھ ساتھ ظاہری قوت کی زیادتی ہوتی ہے اسی قدر وہ کامیاب ہوتا ہے۔ اسی لئے جب تک انبیائے کرام نے بھی روحانی قوت کے ساتھ مادی طاقت کا استعمال نہیں کیا اور ظلم کو روکنے کے لئے سختی سے کام نہیں لیا، اُس وقت تک وہ بھی احکامِ الٰہی کو پوری طرح لوگوں کے پاس نہیں پہنچا سکے۔"

مقاومتِ منفی جب علماء نے مقاومتِ منفی کے طور پر ۱۹۰۵ء میں شاہ عبدالعظیم میں بست اختیار کیا تو اس خبر سے ایک طرف شہر میں تہلکہ مچ گیا اور ہڑتال ہو گئی اور حکومت کی سختی کے باوجود لوگوں نے ہڑتال جاری رکھی اور آہستہ آہستہ علماء کے ساتھ ہمدردی کے باعث تقریباً دو ہزار آدمی وہاں جمع ہو گئے۔ ملک المتکلمین نے ایک طرف حکومت کی سختی اور دوسری طرف لوگوں کے عملی احتجاج سے فائدہ اٹھایا۔ اور ایک خفیہ جلسہ اپنے گھر منعقد کیا۔ جس میں حسب ذیل پانچ آدمی خاص طور سے شریک ہوئے۔

(۱) سید محمد رضا مساوات

(۲) صحاف باشی

(۳) آقا محمد حسین تاجر

(۴) معین نظام

(۵) عبدالخالق

ملک المتکلمین نے ان لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس بست کے واقعہ کو خاص طور پر لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ حکومت کی سختی کا عوام کو پتہ چل جائے۔ اس کے علاوہ ملک المتکلمین کو اس امر کا پتہ چل چکا تھا کہ عین الدولہ نے خفیہ طور پر بعض علماء کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے تاکہ وہ بست ترک کر دیں، جن میں آقا میرزا سید احمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جن کو پانچ ہزار تومان خاموشی سے بھیجے گئے ہیں اور ظاہری طور پر ان کی اس طرح نظر بندی کی گئی کہ گویا وہ حکومت کی قید میں ہیں۔

ایثار و جرأت حقیقت یہ ہے کہ وزیر اعظم عین الدولہ، خود شاہ اور عوام کے درمیان آہنی دیوار تھا اور مظفر الدین شاہ جیسے نیکدل انسان کے سامنے پورے واقعات نہیں آسکتے تھے۔ اس لئے ملک المتکلمین نے اس امر کی کوشش کی کہ جس طرح سے بھی ہو سکے بادشاہ کو براہِ راست تمام حالات سے مطلع کیا جائے۔ لہذا اس کے لئے سفیرِ ترکی سے ملاقات کی جو مشروطہ کا طرفدار تھا، تاکہ وہ جملہ حالات بادشاہ کے گوش گزار کرے۔ لیکن اس سلسلہ میں خود ملک المتکلمین نے اپنے شرکائے کار سے مشورہ مناسب سمجھا۔ اُدھر بست اختیار کرنے والوں کے لئے نان و نفقہ کے سلسلہ میں بہت تکلیفیں پیش آرہی تھیں اور ان میں دن بدن بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ لہذا ایک طرف تو ملک المتکلمین نے مہاجرین کے پاس سر بر آوردہ لوگ بھیجے تاکہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ لوگوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ دوسری طرف انہوں نے مالی امداد کے لئے یہ انتظام کیا کہ:۔

(۱) سالار الدولہ (برادر محمد علی شاہ) سے آٹھ ہزار تومان منگوائے۔

(۲) اپنا گھر (طہران میں)، اور جائداد (اصفہان میں) سات ہزار تومان میں رہن رکھی۔

ایک ہزار تومان کہیں اور سے لئے۔ اس طرح سولہ ہزار تومان لے کر شاہ عبدالعظیم پہنچے اور یہ رقم علماء کے سامنے رکھ دی۔ علماء اس خطیر رقم کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ملک المتکلمین نے فرمایا: "ہمارا اصل مقصد دوسرا ہے اور اسی کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے حاضر خدمت ہوا ہوں، آج تمام ایران ظلم کے شکنجے میں کسا جا رہا ہے اور دنیا کے تمام مسلمانوں کی نظریں آپ صاحبان پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ہی مسلمانوں کی نجات دینے والوں میں سے ہیں۔ اس لئے آپ ایران کی آزادی کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔"

صدرالعلماء نے کہا "اب کیا کرنا چاہیئے"، ملک المتکلمین نے جواب دیا کہ "میں کسی کی پروا کئے بغیر صحیح بات کہنے سے گریز نہیں کروں گا۔ اور وہ یہ ہے کہ صرف میرے خیال کے مطابق بلکہ ان لوگوں کے عقیدہ کے مطابق بھی جنھیں ایران سے محبت ہے اور جو اس کی عزت کے خواہشمند ہیں، آج دنیا کی نیکی اور آخرت کی بھلائی اسی میں ہے کہ خود علماء آگے بڑھ کر بہادری کے ساتھ اسلام دوستی کا ثبوت دیں اور اس ملک کے لوگوں کو ظلم کی قید اور استبداد کی غلامی سے نجات دلائیں۔ اور اپنے نام کو قومی سرداروں کی فہرست میں شامل کر لیں۔ وہ اپنی جوانمردانہ ہمت سے ایران اور اسلام کو ظلم سے نجات دلائیں تاکہ ان کا نام انسانیت کے خادموں میں لکھا جائے۔"

اس گفتگو کے بعد علامہ طباطبائی رو پڑے اور ان کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ لیکن علامہ بہبہانی خاموش رہے۔ اس کے بعد صدرالعلماء نے کہا "تب کیا کرنا چاہیئے۔" ملک المتکلمین نے غیر معمولی جرأت اور ہمت سے کام لے کر کہا کہ آپ جیسے علماء کے لئے تو یہ مناسب ہے کہ اس ظلم کی دیوار کو توڑ دیں اور لوگوں کو ظلم سے نجات دلائیں۔

ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم "قانون اور عدالت کے سایہ میں زندگی بسر کریں اور بادشاہ قوم کے نمائندوں کو "پارلیمنٹری حکومت بنانے کی دعوت دے۔"

تاریخی فیصلہ سب اس مطالبہ سے متفق ہو کر اس تاریخی گفتگو کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ نصرۃ السلطان کا بیان ہے کہ ملک المتکلمین کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی اور وہ تحریر ان کی نگاہ میں ایک قیمتی خزانہ کے برابر تھی۔ اس تحریر کو انہوں نے فوراً اپنی جیب میں رکھ لیا اور بقول یحییٰ دولت آبادی یہ کہا کہ "میں وصیت کرتا ہوں کہ اس آزادی کی سند کو جس نے ایران کو غلامی کی قید سے نجات دلائی ہے، میرے مرنے کے بعد میرے کفن میں رکھ دیا جائے۔"

پروفیسر براؤن نے بھی اس تاریخی عہدنامہ کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے چنانچہ طے پایا کہ بست کے نمائندے ایک درخواست مرتب کریں جو مذکورہ مطالب پر مبنی ہو اور وہ درخواست سفیر ترکی کے ذریعہ بادشاہ کو پیش کر دی جائے۔ آدھی رات کو ملک المتکلمین اور نصرۃ السلطان دونوں خوشی کے عالم

میں طہران واپس آ گئے اور علماء کے اس فیصلہ سے آزادی خواہوں کو مطلع کیا۔

لیکن اسی زمانے میں بادشاہ کی طبیعت خراب ہو گئی اور فالج کا اثر غالب آ گیا۔ اس دوران میں جب ایک وفد بادشاہ سے ملنے گیا تو عین الدولہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "میں صاحب اختیار نہیں ہوں جو کچھ بادشاہ کا حکم ہو گا اسی پر عمل کروں گا۔"

اس کے علاوہ عین الدولہ ملک المتکلمین کی اخلاقی جرأت سے اس حد تک خائف ہو چکا تھا کہ اب اس کے لئے ان کو گرفتار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ملک المتکلمین اور حاجی شیخ محمد کو رات کے وقت گرفتار کر لیا جائے۔ شہر میں کرفیو نافذ کرنے کے بعد فوج کا پہرہ لگا دیا گیا تھا، لوگوں کی آمد و رفت پر سخت پابندی تھی اور ان کو تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں کہ وہ کسی طرح حکومت کی مخالفت ترک کر دیں۔

ملک المتکلمین کے مکان کا محاصرہ

محمد علی ملک زادہ نے بیان کیا ہے کہ "جب عین الدولہ کے پرائیویٹ سکرٹری قوام السلطنۃ کو ملک المتکلمین کی گرفتاری کے حکم کے متعلق معلوم ہوا تو اس نے کسی کے ذریعہ یہ پیغام بھجوایا کہ آپ آج رات میرے مکان پر آ جائیں یا وثوق الدولہ کے مکان پر چلے جائیں اور رات کو اپنے گھر نہ ٹھہریں۔ چنانچہ ملک المتکلمین نے وہ رات وثوق الدولہ کے مکان میں بسر کی۔ اُدھر آدھی رات کو سوار اور پیادوں کی ایک بڑی تعداد نے ملک المتکلمین کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔

سپاہی سیڑھیوں کے ذریعہ مکان میں اُتر گئے اور دروازہ کھول دیا منظم الملک بیس آدمیوں کی جماعت کے ساتھ گھر میں گھس گیا اور عورتوں کو ڈرا دھمکا کر اُن سے ملک المتکلمین کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ اور جب کوئی پتہ نہیں چلا اور مکان کا کونہ کونہ چھان مارا تو ان کے دونوں بچوں محمد علی ملک زادہ اور اسد اللہ ملک زادہ کے ساتھ ایک مہمان بچے کو بھی گرفتار کر لیا۔ آخر کار بڑی مشکل سے اس مہمان بچہ کو تو چھوڑ دیا لیکن دوسرے دونوں بچوں کو لے گئے۔

میرزا محمد علی خان نصرۃ السلطان کو رات ہی کو اس واقعہ کا پتہ چل گیا کیونکہ ان کا مکان بالکل قریب تھا۔ وہ علی الصبح وثوق الدولہ کے مکان پر گئے اور ملک المتکلمین کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔

اخلاقی جرأت کا مظاہرہ

ملک المتکلمین اپنی ذاتی شجاعت کے سبب فوراً واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے اور وثوق الدولہ قوام السلطنہ اور نصرۃ السلطان کے منع کرنے کے باوجود وہ نہ مانے۔ یہاں تک کہ جب وثوق الدولہ نے کہا کہ ممکن ہے آپ قتل کر دیئے جائیں تو انہوں نے کہا "بہتر ہے کہ اب یا اس طرف فیصلہ ہو جائے یا اُس طرف۔"

آخر کار ملک المتکلمین نے گاڑی منگوائی۔ ٹوپی سر پر رکھی اور دھوپ کی عینک لگائے ہوئے وہاں سے نکل کر جامع مسجد پہنچ گئے۔

تقریباً اُسی وقت علامہ طباطبائی اور علامہ بہبانی اور صدر العلماء بھی جامع مسجد پہنچ گئے تھے۔ ملک المتکلمین نے لوگوں کی پریشانی کا احساس کرتے ہوئے رات کے پورے واقعات لوگوں کے سامنے پیش کر دیئے اور فرمایا "اب وقت آگیا

ہے کہ ہم اپنی تکلیفوں کا اظہار خود اپنی زبان سے کریں۔ ملک المتکلمین نے اس کے بعد ایک پر جوش تقریر کی اور اس کا اثر لوگوں پر اس قدر ہوا کہ وہ سب اپنی جانیں فدا کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

مسجد میں لوگوں کا شور آسمان تک پہنچ رہا تھا۔ شہر میں ایک انقلاب برپا تھا۔ لوگ جوق در جوق مسجد میں پہنچ رہے تھے۔ دوکانیں بند ہو چکی تھیں، آہستہ آہستہ شہر کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ سپاہیوں نے گولی چلا دی۔ کچھ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ لوگوں کی کثیر تعداد مسجد میں جمع تھی اور وہ کسی طرح مسجد سے باہر جانا نہیں چاہتے تھے۔ محمد خان نصر السلطنۃ کمانڈر انچیف نے ان لوگوں سے کہا کہ مسجد کو خالی کر دیا جائے اور بادشاہ سے ملاقات کر کے اس کے سامنے اپنی درخواست پیش کریں۔ آزادی خواہوں نے مسجد تو خالی نہ کی البتہ بادشاہ کے پاس یہ لکھ کر بھیج دیا کہ "فوراً عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جائے یا ہم سب کو قتل کر دیا جائے یا ہمیں طہران چھوڑنے کی اجازت دی جائے۔" وزیر اعظم عین الدولہ نے یادداشت پر غور کرنے کے بعد صرف آخری شرط کو مانا۔

مہاجرت کبیر آخر کار آزادی خواہوں کے راہنما ۵ اگست ۱۹۰۶ء کو علماء اور سر برآوردہ لوگوں کو ساتھ لے کر قم کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک روسی مصنف نے لکھا ہے کہ "میں نے سینکڑوں لوگوں کو قم جاتے دیکھا۔ میں نے ملک المتکلمین اور سید جمال الدین واعظ سے ملنے کی کوشش کی۔ حسن اتفاق سے وہ ایک قریبی سرائے میں مل گئے چنانچہ میں نے

سوال کیا کہ "جب آپ کے یہاں سو سے زائد آدمی پڑھے لکھے نہیں ہیں اور فیں دنیا کے حالات کا علم نہیں ہے اور جدید خیالات سے انہیں واقفیت نہیں ہے تو وہ کس طرح اس انقلاب کے لئے تیار ہو سکتے ہیں اور کس طرح لوگوں کی زندگیاں اُن کے سپرد کی جا سکتی ہیں۔" ملک المتکلمین نے جواب دیا آزادی ایک ایسی نعمت ہے کہ خداوند عالم نے بغیر کسی قید اور شرط کے اپنے بندوں کو دی ہے جس دن آدم کو پیدا کیا گیا اُسی دن اس کو عقل اور آزادی بھی عطا کی گئی۔ انسان انہی دو خداداد قوتوں کے ذریعے سے ترقی پا سکتا ہے اگرچہ شروع میں انسان کو ان علوم سے آگاہی حاصل نہ تھی جن سے اس وقت اس کو حاصل ہے۔ تاہم اُس وقت خداوند عالم نے اس کو آزادی سے محروم نہیں کیا تھا اور اس کے پاؤں میں قید کی بیڑیاں نہیں ڈالیں اور یہ شرط نہیں رکھی کہ جب وہ علم اور عقل میں درجۂ کمال تک پہنچے تو اس وقت اس کو آزادی عطا کی جائے۔"

روسی مصنف لکھتا ہے کہ "ملک المتکلمین کی اس پرمغز تقریر کو سُن کر میری آنکھیں کھل گئیں اور میں اُسی وقت سے ایران کی آزادی کا قائل ہو گیا۔"

حالات اب تیزی سے بدل رہے تھے۔ لوگوں کی ہمدردیاں اب آزادی خواہوں کی طرف ہو رہی تھیں۔ فوج میں بھی انقلابی آثار رونما ہو چکے تھے۔ مظفر الدین شاہ کو اب آہستہ آہستہ تمام حالات کا علم ہو چکا تھا۔ آخر کار وہ وقت آ پہنچا کہ اس نے وزیر اعظم عین الدولہ کو معزول کر دیا اور پارلیمنٹ کے قیام کی منظوری دیدی۔

تاریخی دن

۷ / اکتوبر ۱۹۰۶ء کا دن مجلس عوام کے افتتاح کے لئے مقرر کیا گیا۔ یہ دن حقیقت میں ایک تاریخی دن تھا۔ عوام میں جوش و خروش تو تھا ہی، لیکن آزادی خواہوں کے لئے بھی یہ دن ایک بڑی خوشی کا دن تھا۔ اس دن جس قدر زیادہ مسرت کا اظہار کرتے کم تھا۔

افتتاح کے دن صدر اعظم (مشیر الدولہ) کی افتتاحی تقریر کے بعد ملک المتکلمین نے ایک زبردست تقریر کی اور فرمایا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ نیک دل بادشاہ نے قوم کے نیک ارادوں کو پالیا۔ آج خدا کے فضل اور ائمہ کی توجہ اور ان کے کرم سے ہم ایرانیوں کی بدبختی کی اندھیری رات ختم ہوئی اور نیکیوں کا سورج طلوع ہوا۔

افرادِ قوم کی صلاحیتوں کے پیش نظر بادشاہ کی نیک نیتی نے آج عملی صورت اختیار کرلی تاکہ اب وطن کے ہمدرد اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے آزادانہ طور پر گفتگو کر کے گذشتہ خرابیوں کو دور کریں، اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے لائحۂ عمل مرتب کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت کی بنیادوں کی پختگی رعایا کی خوشحالی پر منحصر ہے اور قوم کی پرورش سلطنت کے استحکام پر ہے۔

قوم اگر شخصی آزادی اور فکری استحکام چاہتی ہے تو اسے اسلام اور سلطنت کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ اب خداوند عالم کی عنایتِ کاملہ سے قوم کے نمائندوں اور حکومت میں اتحاد ہو گیا ہے اور اب موقع ہے کہ یہ نمائندہ جماعت عوام الناس کو بیدار کرے اور ان کی حفاظت کا ذمہ لے۔ اب وقت آگیا ہے کہ علماء اور وزراء کی رہنمائی میں تمام برائیوں کو دور کیا جائے۔ ہماری قوم

کو اس بات پر پورا بھروسہ ہونا چاہیئے کہ مجلس کے نمائندے اور وزراء اپنی اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہونگے۔"

ملک المتکلمین کی بے پایاں مسرّت کا مظاہرہ

قوام الدولہ کا بیان ہے کہ "تقریر کے بعد انہوں نے سید جمال الدین واعظ سے مخاطب ہو کر فرمایا" اے سیّد! یہی وہ پارلیمنٹ تھی جس کا مطالبہ ہم عرصہ سے کرتے چلے آرہے تھے۔" یہ کہتے ہی انہوں نے دو مخلص دوستوں کی مثل ایک دوسرے کو گلے سے لگایا اور خوشی کے آنسو ان کی آنکھوں سے جاری ہوگئے۔ ملک المتکلمین ہمارے قریب بیٹھ گئے اور ہم گفتگو میں مصروف ہوگئے۔ سید جمال الدین واعظ نے کہا کہ "آج آپ کے چہرے سے نور ٹپک رہا ہے" ملک المتکلمین نے مسکراتے ہوئے کہا "صابون کی چمک ہے"۔ سید صاحب نے کہا "ایران میں پارلیمنٹ قائم ہوگئی ہے، ہم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ اب آیئے ہم مصر یا ہندوستان چلیں" ملک المتکلمین نے جواب دیا۔ " اے سیّد! صحیح معنوں میں آج ہی سے ہماری ذمہ داریاں شروع ہوتی ہیں۔ یہ پارلیمنٹ اُس بچّہ کی مانند ہے جس کی حفاظت اس لئے ضروری ہے کہ سینکڑوں دشمن اس کی گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں، اگر اس کی حفاظت نہ کی جائے گی تو وہ بالغ ہونے سے پہلے ہی مر جائے گا۔ اور ہمارے اوپر بالخصوص یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اس کی حفاظت اور پرورش کریں۔ یہاں تک کہ وہ ایک طاقتور اور تندرست جوان بن جائے۔"

۷ر جنوری ۱۹۰۷ء کو مظفر الدین شاہ کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا

محمد علی شاہ تخت نشین ہوا۔ محمد علی شاہ تحریک مشروطیت کے شروع ہی سے اُس کا مخالف تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس کی مخالفت نے شدت اختیار کرلی۔

چنانچہ اس کی مخالفت کا مقابلہ کرنے اور پارلیمنٹ کے وجود کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک انقلابی کمیٹی عمل میں آئی۔ جس کے ارکان حسب ذیل تھے۔

(۱) ملک المتکلمین
(۲) سید جمال الدین واعظ
(۳) مرزا جہانگیر خان۔
(۴) سید محمد رضا مساوات
(۵) تقی زادہ۔
(۶) حکیم الملک
(۷) سید عبد الرحیم
(۸) سید جلیل اردبیلی
(۹) معاضد السلطنۃ
(۱۰) میرزا سلیمان خان مے کدہ۔
(۱۱) حسین قلی خان نواب۔
(۱۲) میرزا علی اکبر خان
(۱۳) حاجی مرزا ابراہیم آقا۔

(۱۴) مرزا داؤد خان
(۱۵) ادیب السلطنة
(۱۶) نصرة السلطان

کمیٹی کے جلسے آدھی رات کو حکیم الملک کے گھر (واقع خیابان لُپت خانہ) میں منعقد ہوتے تھے اور صبح ہونے سے قبل اُس کے ممبران متفرق ہو جایا کرتے تھے۔ مرزا محمد نجات۔ حسین آقا پرویز۔ مرزا محسن نجم آبادی کمیٹی کے فیصلوں کی اطلاع دوسرے شہروں میں پہنچاتے تھے۔ کمیٹی نے اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا کہ قومی فوج کے لئے بہادر اور جوان مردوں کی تنظیم کی جائے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں حکومتِ مشروطہ کے موافق ہزاروں جوان پارلیمنٹ کی محافظت کے لئے قومی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ تکلیفوں کے باوجود ہتھیار بھی اکٹھے کرنے شروع کئے۔ لوگوں نے کاروبار ترک کئے اور پریڈ کرنے لگے۔ اس عوامی جذبہ کا اثر یہاں تک پڑا کہ بعض فوجی افسروں نے بھی اپنی ملازمتوں سے استعفیٰ دیدیا (مثلاً یار محمد افشار۔ ابوالفتح زادہ اور منشی زادہ) اور قومی فوج کی تنظیم میں مصروف ہو گئے۔ قومی انجمنوں کے اراکین کے علاوہ بہت سے طلباء بھی قومی فوج میں شریک ہو گئے۔ اس فوج کے سپاہی ہر روز پارلیمنٹ کی حفاظت اور قومی سرداروں کی محافظت کے لئے پہرہ دیتے تھے۔

یہ جذبہ یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ بہت سے مشروطہ خواہوں نے اپنے گھر کا سامان بھی بیچ بیچ کر اُس روپیہ سے بندوقیں خریدیں اور اس طرح آزادی

کی حفاظت کرنے والوں نے دفاع کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس اثناء میں محمد علی شاہ نے میرزا علی اصغر خان آتابکِ اعظم کو یورپ سے بلا کر وزیر اعظم مقرر کیا اور حکومت مشروطہ کی مخالفت میں اُس کی امداد کا طالب ہوا۔

آتابک اعظم ایک ماہر سیاستدان تھا۔ وہ عوام کے مزاجوں سے خوب آشنا تھا۔ ملک المتکلمین اپنی جرأت اور صداقت نفس کی وجہ سے اس قدر مشہور تھے کہ ان کے ساتھی ان سے کوئی ایسا کام نہیں کرا سکتے تھے جو ان کے خیال میں "وطن" کی محبت کے خلاف ہو۔

آخر کار اس نے ظہیر الدولہ جو ایک مشہور آزادی خواہ تھا اور ملک المتکلمین سے اس کے تعلقات بھی اچھے تھے۔ خود آقا سید یعقوب انوار سابق ممبر پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ ملی) کا بیان ہے کہ میں ملک المتکلمین سے ملنے کے لئے گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ظہیر الدولہ سے ملنے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ملک المتکلمین (یعقوب انوار سے) مجھے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ میں تیار ہو گیا۔ جب ہم ظہیر الدولہ کے مکان پر پہنچے تو اس نے وسط باغ ہی سے ملک المتکلمین کا استقبال کیا اور بہت احترام سے کمرے میں لایا۔ آخر کار گھبرا کر اُن سے کہا کہ "صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ سفیر روس کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ میرے آپ کے ساتھ نہ صرف مراسم دوستی ہیں بلکہ میرے دل میں آپ کی عزت ہے اس لئے وہ میرے مکان پر آپ سے ملنا چاہتا ہے اور اب سفیر روس میرے مکان پر ایک گھنٹہ سے آیا ہوا بیٹھا ہے۔" ملک المتکلمین

نے یہ سنتے ہی کہا۔ "تم نے یہ اچھا نہ کیا" اور بغیر چائے پیئے ہوئے اُٹھے اور مجھ سے کہا "سید یعقوب آؤ چلیں۔" چنانچہ ہم دونوں باہر آ گئے۔

دوسری مرتبہ کا واقعہ خود محمد علی ملک زادہ نے بیان کیا "ایک دن میرے والد اپنے کمرے میں بیٹھے باہر سے آئے ہوئے تار پڑھ رہے تھے کہ اچانک بارنوفسکی سفیر روس کا مشیر اچانک آیا اور اپنا تعارف کرانے کے بعد اُس نے بغیر اجازت اندر آنے کی معذرت چاہی اور کہا اس وقت میں ایک فرض کو سرانجام دینے حاضر ہوا ہوں اس لئے مجھے آنا پڑا۔ یہ کہہ کر ایک پیکٹ جس پر مہر لگی ہوئی تھی میرے والد کے سامنے رکھ دیا اور یہ کہنے لگا۔ یہ پیکٹ سفیر روس نے تحفہ کے طور پر جناب کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے بہت بہت سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں لیکن افسوس کوئی موقع نہیں ملتا۔ ازراہِ کرم یا تو ہم سے ملاقات کیجیے یا مشروطیت کا خیال دل سے نکال دیجیے۔ اور اس سلسلہ میں اتابک کی مخالفت ترک کر دیجیے بلکہ اس کی مدد کیجیے تاکہ وہ اپنا کام خیر و خوبی سے کر سکے اور وہ جو اصلاحات رائج کرنا چاہتا ہے وہ باسانی کر سکے۔

میرے والد محترم نے جواب دیا کہ "میری اتابک کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں ہر اُس کا طرفدار ہوں جو آئینی آزادی کا طالب ہے اور ایران کی بہتری چاہتا ہے۔ ازراہِ کرم یہ پیکٹ واپس لے جائیے اور معذرت سے واپس کر دیجیے۔" بارنوفسکی نے برہمی سے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ روس سے دشمنی کا مطلب کیا ہے؟"

میرے والد ہنسے اور کہنے لگے "میں نے جس دن سے ایران کی آئینی آزادی کا ارادہ کرلیا ہے، تمام معاملات صاف دل سے طے کرتا ہوں،
بارنوفسکی نے پیکٹ اٹھایا اور بغیر خدا حافظ کہے باہر نکل گیا۔

اب واضح ہو گیا کہ اتابک کی سازشیں کس طرح کام کر رہی تھیں۔ چنانچہ ملک المتکلمین نے انقلابی کمیٹی کے سامنے یہ واقعات رکھ دیئے۔ دوسری طرف اتابک نے تقی زادہ سے ملنے کی بھی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اس سلسلے میں ملک المتکلمین نے انجمن دروازہ قزوین کے جلسہ میں جہاں تین ہزار آدمیوں سے کم نہ ہوں گے، انہی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "بادشاہ مشروطیت اور بنیادی قانون کی حفاظت کے لئے حلف اٹھا کر بھی اب اپنی تمام قوتوں اور غیر ملکوں کے سفیروں کے ساتھ مل کر بعض ملاؤں اور وزیر اعظم کے کہنے کے سبب پارلیمنٹری حکومت کی جڑوں کو جڑوں کو کھوکھلا کرنے اور قوم کے حقوق کو ضائع کرنے کے لئے سینکڑوں آزادی چاہنے والوں کے خون سے کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

بادشاہ نے مشروطیت کو ختم کرنے کے لئے اتابک کو باہر سے بلایا ہے اور اسی لئے اس کو اس منصب وزارت عظمیٰ پر سرفراز کیا ہے۔ اس لئے ہر آزادی چاہنے والے شخص پر یہ فرض ہے کہ اس ظلم کے درخت کو جڑ سے اکھیڑ دے ورنہ خود ہماری بنیادوں اور پارلیمانی طرز حکومت کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔"

تقریر جاری رکھتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ "اے جاسوسو! اور حکومت کی طرف سے تقریر لکھنے والو! میری طرف سے بادشاہ کو یہ کہہ دو کہ نادانی کی

باتیں کرنے اور دوسرے غیر ملکیوں کے بہکانے میں آنے کی بجائے (کہ اس سے ہماری بدبختی اور پریشانی میں اضافہ ہوگا) دوسری قوموں کے انقلاب اور تحریک بیداری کا مطالعہ کرے اور پچھلے لوگوں کے حالات سے عبرت حاصل کرے۔

میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس کے ہاتھ میں تمام مخلوق کی جان ہے کہ ایران کی ترقی اور آرام کا انحصار مشروطیت کے جھنڈے کے نیچے آنے اور بنیادی قانون کے جاری ہونے پر ہے اور ہر وہ بادشاہ جو ان دو راستوں کے علاوہ دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو اس کا انجام سوائے بدبختی اور حکومت کے زوال کے اور کچھ نہیں ہوگا۔"

ملک المتکلمین تعریف اور توصیف کے غلغلوں کے درمیان منبر سے اترے ایک نوجوان آگے بڑھا، ملک المتکلمین کے ساتھ کچھ دور تک چلا اور آہستہ لیکن پرحوصلہ آواز سے کہا کہ یہ دھن کا پکا اور ارادے کا سچا انسان سلامت روی اور انتہائی ذمہ داری کے ساتھ عوام کی آزادی کے بھاری پتھر کو اٹھانے کے لیے تیار کرچکا جس کے اٹھانے کے خیال ہی سے اچھے اچھے قوی دل انسانوں کے پتے پھٹ جاتے ہیں۔ اور جس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہر قوم کے بس کی بات نہیں۔

اتابک ظاہر میں قوم پرستوں کا طرفدار تھا لیکن حقیقت میں اس کی تمام تر کارروائیاں تخریبی تھیں جو تھوڑے ہی عرصہ میں قوم پرستوں پر ظاہر ہوگئیں اور اس کا وجود ملت کے لئے خطرناک تصوّر کیا گیا۔

چنانچہ اتابکِ اعظم ابھی اپنے خطرناک عزائم میں کامیاب نہیں ہونے پایا

تھا کہ ۲۰ راگست ۱۹۰۷ء کو جبکہ وہ پارلیمنٹ کے اجلاس سے باہر آرہا تھا، تو عباس آقا تبریزی کی گولی نے اس کا کام تمام کردیا جس کے بعد قاتل نے خودکشی کرلی۔

پولیس اس کی نعش کو اٹھاکر لے گئی اور اسے کنوئیں میں ڈال دیا۔ اگلے دن صبح کو ملک المتکلمین نے کوتوال شہر کے پاس میرزا سلیمان میکدہ، محمد رضا مساوات اور محمد علی ملک زادہ کو اس مقصد کے لئے بھیجا کہ وہ اجازت دے کہ عباس آقا تبریزی کی نعش کنوئیں سے نکال کر قبرستان میں دفن کردی جائے۔ چنانچہ ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور عباس آقا تبریزی کی نعش کنوئیں سے نکال کر قبرستان میں دفن کردی گئی۔

محمد علی شاہ اگرچہ ظاہر میں پارلیمنٹ کا طرفدار تھا۔ لیکن اس حادثہ نے اس کو سخت متاثر کیا اور وہ پارلیمنٹ کے وجود ہی کو ختم کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔

واقعۂ میدانِ توپ خانہ

یہ واقعہ ایسا تھا جس میں محمد علی شاہ نے دونوں گروہوں (پارلیمنٹ کے موافقین اور مخالفین) کو آپس میں لڑانا چاہا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض لوگوں نے ایک طرف سے پارلیمنٹ پر حملہ کیا، دوسری طرف سے مسجد سپہ سالار پر دھاوا بول دیا۔

ملک المتکلمین اس قسم کے واقعات پر تقریروں کے ذریعہ تبصرہ کرتے اور قوم کو ان ناسازگار حالات سے مطلع کرتے تھے۔ اس موقع پر بھی انہوں نے تقریر کی اور بادشاہ کی خفیہ سازشوں پر پورے طور پر روشنی ڈالی اور قوم کو

قدم اُٹھانے کی طرف متوجہ کیا۔ ملک المتکلمین کی یہ تقریر اس قدر پرجوش تھی بقول علامہ دہخدا" ان کی تقریر کے درمیان میں ایک شور اٹھا اور معلوم ہوا ایک آزادی خواہ نے جوش میں آکر اپنا پیٹ چاک کر ڈالا ہے۔

پارلیمنٹ کی مخالفت میں علماء میں سے شیخ فضل اللہ لوری، بادشاہ کے اس طرفداروں میں تھے۔

اس صورت حال کے پیش نظر ملک المتکلمین نے دوسرے شہروں میں تار دیے کہ" بادشاہ نے بار بار حلف اٹھانے کے بعد بھی آزادی خواہوں کی مخالفت پر کمر کس لی ہے اور اگر آپ جلد ہی ہماری مدد کے لئے نہیں آئیں گے تو پانی سر سے اونچا ہو جائے گا۔"

ملک المتکلمین کی عالی ہمتی اور صائب رائے

اس درمیان میں سید جمال الدین واعظ، میرزا جہانگیر خان، قاضی قزوینی، مرزا ابراہیم خان، محمد رضا مدیر مساوات، یمین السلطنۃ مل کر ملک المتکلمین کے پاس آئے اور اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ" بہتر ہے شیخ فضل اللہ لوری کو قتل کر دیا جائے تاکہ اس کی مخالفت ختم ہو جائے اور بادشاہ کا ایک بڑا بازو لوٹ جائے۔"

ملک المتکلمین نے اس تجویز کی حسب ذیل وجوہ کی بناء پر مخالفت کی:۔

(۱) اس کے قتل سے لوگوں کی مخالفت میں اضافہ ہوگا۔

(۲) اگر اس کو قتل کر دیا گیا تو کل دوسرا آدمی اس کی جگہ آجائے گا۔ اس کا قتل شاخ کو کاٹنے اور درخت کو باقی رکھنے کے مترادف ہے۔

(۳) اصل محرک تو محمد علی شاہ ہے جو سب کو روپیہ دے رہا ہے اور روسیوں

کے اشاروں پر ناچ رہا ہے اور ان ہی کی شہ پر پارلیمنٹ کی مخالفت کر رہا ہے
شیخ فضل اللہ نوری زندہ رہے یا مُردہ۔ اصل کام تو محمد علی شاہ کو راستہ سے
ہٹانے سے درست ہو گا۔

اِن وجوہ نے سب کو مطمئن کر دیا اور وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔

ملک المتکلمین کا اٹل فیصلہ ملک المتکلمین کی یہ رائے اس قدر صحیح تھی کہ جس پر آخر کار انقلابی کمیٹی کو عمل کرنا پڑا اور اسی کے نتیجہ میں بادشاہ پر بم پھینکنے کا حادثہ رونما ہوا۔ لیکن وہ اس حادثہ میں محفوظ رہا۔
اس سلسلہ میں چند اشخاص پر شبہ کیا گیا اور جب مصطفیٰ خان حاجب الدولہ حاکم طہران نے اس کی تفتیش کے سلسلہ میں چند سپاہیوں کو مامور کر دیا اور انہوں نے عقبی دیوار سے حیدر خاں عمو اغلی، اسماعیل قفقازی، ضیاء السلطان، امان اللہ خان تبریزی کے مکانوں میں داخل ہو کر ان کو قید کر لیا، تو ملک المتکلمین نے سخت احتجاج کیا۔

آخر کار اس معاملہ میں بھی بادشاہ کو زک کھانی پڑی اور وہ مجبور ہو گیا کہ اس امر کی تحقیق کے لئے ایک کمیشن کا تقرر کرے۔ کمیشن نے مصطفیٰ خان سے جواب طلب کیا اور اُس کے خلاف صادر کیا۔ مشتبہیں عدالت کے سپرد کر دیئے گئے۔ عدالت نے عدم ثبوت کی بنا پر حیدر خان عمو اغلی اور اسماعیل قفقازی کو چھوڑ دیا لیکن جب بادشاہ کے اصرار پر ضیاء السلطان کو نہ چھوڑا گیا، تو ملت نے پھر اس امر پر زور دیا کہ بادشاہ اس معاملہ میں مداخلت نہ کرے

ملک المتکلمین کا ایثار اس درمیان میں بادشاہ اور پارلیمنٹ کے مابین صلح کرانے کی کوشش عمل میں لائی گئی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں یحییٰ دولت آبادی نے ملک المتکلمین سے کہا "بہتر ہے آپ بھی اپنے پاس سے ایسے لوگوں کو علیحدہ کر دیں جن سے بادشاہ ناراض ہے۔"

ملک المتکلمین نے فرمایا کہ "اگر مملکت کی بہتری اس امر میں ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں تو میں تیار ہوں اور میں خود اپنے آپ کو اس کام کے لئے پیش کرتا ہوں۔"

یحییٰ دولت آبادی یہ سن کر دم بخود ہو گئے اور کہنے لگے "مجھے تو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ آپ اس قدر جذبۂ ایثار سے کام لیں گے اور اس امر کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ شاہ اور پارلیمنٹ میں اتفاق کی خاطر ملک چھوڑ دیں۔"

یہ ضرور ہے کہ وہ ایران کی بدبختی کا سبب خود بادشاہ کی ذات کو سمجھتے تھے اور اس کے اظہار میں انہیں کوئی باک نہیں تھا جس کی مثال اس واقعہ سے ملتی ہے کہ جب روزنامہ مساوات میں ایک اداریہ اس عنوان "شاہ در چہ حال است" سے لکھا گیا تو اس اداریہ نے شاہ پر بم کا کام کیا۔ اس اداریہ کے چند فقرے یہاں درج کئے جاتے ہیں تاکہ ترجمہ کے سبب اس کے زورِ قلم کے اندازہ کرنے میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو سکے۔

"ہاں اے ایرانیاں! ہش دارید کہ روزگار بر دفترِ استبدادیان و شاہ بازیہا قلم درکشید۔ ہمیں کہ ملتِ ایران ندائے آسمانی بگوشش رسید، بلند شد و بامردانگی در مقابلِ ظلم و استبداد بیجا نفسانی

پرداخت وحکومت بت پرستی یا شخص پرستی را وارواژگون کرد۔ و فہمیدہ کسی را باید بر ریاست وسرپرستی خود انتخاب کند کہ ملت دوست وعدالت پرور باشد۔

۵ ریاست بدستِ کسانی خطا است
کہ ازدستِ شان دستہا برخداست

بادشاہ نے عدالت میں مساوات کے خلاف دعویٰ دائر کیا اور مؤید السلطنۃ محمد حسین کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ محمد رضا" مدیر مساوات" نے اپنی طرف سے ملک المتکلمین کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ چنانچہ ملک المتکلمین نے عدالت کو اس امر کی اطلاع دیدی کہ میں مساوات کی طرف سے وکالت کروں گا۔ آخر کار بڑی مشکل سے بادشاہ کو اس امر کے لئے راضی کیا گیا کہ وہ اپنا مقدمہ عدالت سے واپس لے لیں۔

ان حالات میں قاچاری خاندان کے شاہزادے محمد علی شاہ کے طریقۂ کار سے ازحد فکرمند تھے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے ان افعال سے سلطنتِ قاچاریہ کے زوال کا باعث بنے۔ چنانچہ سب مل کر خاندانِ قاچار کے ایک بزرگ ترین فرد عضد الملک کے پاس آگئے اور اس سے کہا کہ وہ بادشاہ کو صحیح راستے پر لائے۔ ان کے علاوہ تمام قومی انجمنیں جن کے اراکین کی تعداد دس ہزار تھی قوم کے رہبروں کی زیرِ نگرانی عضد الملک کے مکان پر آئیں اور ان کے سامنے قوم کے مطالبات پیش کرتے ہوئے ان سے یہ خواہش کی کہ وہ قاچار خاندان کے بزرگ کی حیثیت سے ان مطالبات کو شاہ کے سامنے پیش کریں۔

جس کے بعد عضد الملک نے وعدہ کیا کہ بادشاہ کے پاس جاکر قوم کے مطالبات پورا کرانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ ان حالات سے متاثر ہوکر بادشاہ مجبور ہوگیا کہ وہ امیر بہادر جنگ، شاپشال، علی بک، موقر السلطنہ، امین الملک، مفاخر الملک کو دربار سے نکال دے اور ملازمت سے معزول کردے۔ لیکن افسوس کہ سفرائے روس اور انگلستان نے اس کی مخالفت کی اور اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔

پارلیمنٹ کو ختم کرنے کے سلسلہ میں بادشاہ کی خفیہ کاروائیاں جاری رہیں یہاں تک کہ پارلیمنٹ کو تباہ کرنے کا مقررہ دن آپہنچا۔

بادشاہ کی یہ کارروائیاں قوم پرستوں اور پارلیمنٹ کے محافظین پر ظاہر ہوچکی تھیں اور وہ پارلیمنٹ کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاچکے تھے۔

آزادی کی آخری رات

میرزا یحییٰ دولت آبادی کا بیان ہے کہ کچھ رات گزرنے پر میں پارلیمنٹ کے میدان میں گیا۔ گنتی کے چند آدمی وہاں موجود تھے، کچھ پہرہ دے رہے تھے، کچھ لوگ مجاہدین کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جن میں ملک المتکلمین۔ مرزا جہانگیر خان۔ قاضی قزوینی۔ مرزا قاسم خان صور۔ مرزا داؤد خان علی آبادی۔ بہار الواعظین۔ شیخ علی ناطق الملۃ۔ میرزا علی اکبر خان ارادتی۔ سید حسن حبل المتین۔ مرزا محمد علی ملک زادہ شامل تھے۔ یہ سب لوگ اس طرح بیٹھے تھے گویا موت کا استقبال کر رہے ہیں۔ مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جیسا کہ شب عاشورہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ چند مخلص اور شمعِ آزادی کے پروانے جمع تھے۔ اسی وقت میں نے حاجی سلطان علی کا مشہور قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔

۵ حبیب در شب عاشورہ با صحابہ نشست
چنیں بگفت کہ ای برگزیدگانِ الست الخ

ملک المتکلمین اور دیگر حضرات یہ قصیدہ سن کر بے اختیار رو پڑے۔

ملک المتکلمین کی آخری تقریر ملک المتکلمین اب خوش تھے اور انہوں نے پوری مسرت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

" رفقاء! امشب آخرین شب دورۂ آزادی و یا شاید آخرین شب زندگانی ما باشد۔ ما در نتیجہ سی سال فداکاری و کوشش بسیار پردۂ ظلم و ستم گری را دریدیم و بیرقِ آزادی و مشروطیت را برافراشتیم۔ و بر تمام دُنیا ثابت کردیم کہ ملّت ایران قابل است کہ در ردیفِ مللِ مترقی و آزاد جہان قرار گیرد، و برای بدست آوردنِ حقوقِ ملّی خود تلاش کند و زنجیرِ عبودیت را از گردنِ خود را بردارد۔ و در مقابلِ ستمگران و ظالمین قیام کند۔ ما تخم آزادی و مشروطیت را در قلبِ ملّتِ ایران کاشتیم۔ اینک موقع آن رسیدہ کہ با خونِ خود آن تخم فشاندہ شدہ را آبیاری کنیم، و بقیمتِ جان خود مشروطیت را جاوید نمائیم۔"

(تاریخ انقلاب مشروطیت ایران جلد چہارم مؤلف ڈاکٹر مہدی ملک زادہ ص ۱۵۳)

میں تقریر کے بعد اُن کے پاس گیا اور اُن سے کہا "کل یقینی طور پر حملہ ہوگا اور آپ کی ذات سب سے زیادہ خطرے میں ہے۔ آپ چونکہ فنونِ جنگ سے واقف نہیں ہیں، اس لئے آپ اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالتے ہیں۔ میں نے آپ کے لئے ایک محفوظ مقام سوچ لیا ہے۔ آپ چند دن وہاں مخفی طور پر رہیں۔ بعد میں جو کچھ ہوگا دیکھ لیں گے۔ میرزا جہانگیر خان نے بھی یہ الفاظ سن لئے اور کہا

"جہاں آپ جائیں گے میں بھی ضرور جاؤں گا۔"

ملک المتکلمین نے اطمینان سے یہ باتیں سنیں اور کہا "اب تو میں صبح تک یہیں رہوں گا چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو۔" میں نے دیکھا کہ اب اصرار کرنے سے فائدہ نہیں اس لئے آخری مرتبہ اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور معانقہ کر کے چلا آیا۔"

پارلیمنٹ کی عمارت پر حملہ

اس طرف بادشاہ نے ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو اپنے پروگرام کے مطابق پارلیمنٹ پر حملے کا حکم دیدیا اور پارلیمنٹ کی عمارت کو توپوں سے تباہ کر دیا گیا۔ سپاہی اس کے اندر داخل ہو گئے اور تمام قیمتی سامان لوٹ لیا۔

پارک امین الدولہ

جب حملہ آور فوج تباہی مچاتی ہوئی پارلیمنٹ میں داخل ہوئی تو آزادی کے رہبر مجبور ہو کر پارلیمنٹ کی شمالی دیوار توڑ کر امین الدولہ کے پارک میں پہنچ گئے اور وہاں سراسیمگی کی حالت میں کھڑے تھے کہ امین الدولہ نے فوراً مکان میں آجانے کے لئے کہا لیکن وہ باغ ہی میں بیٹھے رہے۔ چاروں طرف سے بندوقوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ مرحوم علامہ بہبہانی نے امین الدولہ سے کہا کہ "ملک المتکلمین کی جان خطرے میں ہے ان کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دینا چاہیئے۔" اُس نے جواب دیا: "میں ان کو ایک محفوظ مقام پر پہنچا دینے کے لئے تیار ہوں۔" آقای میرزا محمد صادق طباطبائی نے بیان کیا کہ "میں امین الدولہ کے ساتھ ملک المتکلمین، میرزا جہانگیر خان قزوینی، میرزا داؤد خان علی آبادی، میرزا قاسم خان نائب مدیر صورِ اسرافیل کو لے کر قریب ایک ناتمام

مکان میں گیا اور باہر سے قفل لگا دیا۔ ہم خوش تھے کہ ہم نے اُن کو ایک مصیبت سے بچا لیا ہے۔ لیکن ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ کئی ہزار سپاہی پارک پر حملہ آور ہوئے اور دروازے کو توڑ کر پارک میں داخل ہو گئے۔

لیکن محمد علی ملک زادہ کے بیان کے مطابق سب لوگ یہ اطلاع پا کر اس مکان کے ایک دروازے کو توڑ کر باہر نکل گئے۔ قریب ہی ایک امریکی ہسپتال تھا۔ محمد علی ملک زادہ نے ملک المتکلمین سے کہا: "بہتر ہے کہ آپ وہاں چلے چلیں علاج بھی ہو جائے گا اور جان بھی بچ جائے گی۔" ملک المتکلمین نے کہا "میں اپنی جان بچانا نہیں چاہتا۔ وہ کام کرنا چاہیئے کہ جس سے آزادی پر کوئی آنچ نہ آئے اگر مشروطہ ہی ہاتھ سے نکل جائے تو ہماری زندگی بیکار ہے۔ اگر ممکن ہو تو شاہ عبدالعظیم پہنچ جائیں سب لوگ وہاں جمع ہو جائیں اور چراغِ آزادی بجھنے نہ دیں"

میرزا سید حسن "حبل المتین" کا مکان قریب تھا۔ خیال تھا کہ وہاں چلے جائیں۔ چنانچہ سید حسن سے دریافت کیا گیا۔ انہوں نے کہا "میرا گھر حاضر ہے، چلیے"۔ چنانچہ سب لوگ سید حسن کے گھر پہنچے ہی تھے کہ عورتوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا جس کی آواز سے یہ لوگ اور پریشان ہو گئے اور وہاں سے باہر نکل پڑے سید حسن تو گھر میں چھپ گئے اور جب سپاہی ان کو پکڑنے آئے تو حوض میں کود کر اپنی جان بچائی اور بعد میں برطانوی سفارتخانہ میں پناہ گزین ہو گئے۔ بقیہ اصحاب ابھی وہاں سے نکلے ہی تھے کہ قاسم آقا نے دیکھ لیا اور خوشی کا ایک نعرہ بلند کیا۔ شاہی فوج نے ان سب کو فوراً گرفتار کر لیا اور فوجی بارکوں میں لے جا کر قید کر دیا۔

گرفتار ہونے والوں میں ملک المتکلمین کے ساتھ اُن کا بیٹا محمد علی ملک زادہ، میرزا جہانگیر خان، قاضی قزوینی، میرزا علی اکبر خان، ارادقی د برادر قاضی قزوینی) اور میرزا داؤد علی خان علی آبادی بھی تھے۔ محمد علی ملک زادہ کا بیان ہے کہ گرفتار شدگان کو اس قدر زدوکوب کیا گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکے اور خود ملک المتکلمین کو بھی مہلک زخم لگے اور ان کی ایک انگلی بھی کٹ گئی۔ غلام رضا (میر پنج) نے بھی ان سب کو نازیبا باتیں کہیں۔

اس دوران میں ایک جوان افسر آیا جس کے چہرے سے گھبراہٹ کے آثار ظاہر تھے۔ اُس نے آتے ہی کہا جناب ملک المتکلمین! میں جناب والا سے اس شخص (غلام رضا) کی بداخلاقی کے سبب شرمندہ ہوں اور اس کی بجائے میں معافی خواہ ہوں۔ اس لئے کہ یہ ایرانی نژاد نہیں ہے۔ اگر یہ ایرانی نژاد ہوتا تو جناب ایسے عالی مرتبہ محب وطن کی خدمات فراموش نہ کرتا۔" اس کے بعد وہ بے اختیار رو پڑا اور روسیوں کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ اس کے بعد وہ پھر ملک المتکلمین کی طرف متوجہ ہوا کہ اگر کوئی خواہش ہو تو بیان کیجئے۔ انہوں نے فرمایا کہ" اگر پانی کا گلاس یا شربت کا پیالہ اور تھوڑی سی روٹی ممکن ہو تو ہمارے لئے مہیا کر دیجئے تاکہ جو کچھ ہماری تقدیر میں لکھا ہے اُس کو پوری طاقت سے برداشت کر سکیں۔" تھوڑے ہی عرصہ میں وہ جوان کچھ روٹی اور پنیر لے آیا لیکن شربت نہ مل سکا۔

مرزا جہانگیر خان کو تنہا ایک مکان میں بند کر دیا گیا۔ لیکن ملک المتکلمین کے اصرار پر دوبارہ ان کو واپس لایا گیا اور سب کو ایک ہی کمرہ میں بند کر دیا گیا۔

اسی عالم میں اُس کمرے میں ایک روسی افسر آیا۔ غصّے کے عالم میں زمین پر پاؤں مار مار کر اور اپنے دانتوں کو پیس پیس کر ملک المتکلمین سے کہہ رہا تھا کہ "تم نے دینِ اسلام کو رواج دیا اور مشروطہ کو شروع کیا۔ اب جب تک چاہتے ہو یہیں نماز پڑھو تاکہ یہیں سے سیدھے جنت میں چلے جاؤ۔"

تھوڑی دیر کے بعد لفٹیننٹ ڈاکٹر عزیز اللہ خان آئے۔ انہوں نے زخموں کو دھو کر سینا چاہا لیکن ملک المتکلمین کے زخموں میں سے کافی خون بہنے کے سبب کپڑا بدن پر چپک گیا تھا اور زخموں کو دھونا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی عرصہ میں فوجی سپاہی آ گئے اور بادشاہ کے حکم کے مطابق قیدیوں کو باغ شاہ کی طرف لے گئے لیکن اس طرح کہ وہ خود تو گھوڑوں پر سوار تھے لیکن یہ گرفتار شدگان پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ قاضی قزوینی اور ملک المتکلمین کے لئے بڑھاپے کے سبب دوڑنا بہت مشکل تھا۔ کئی دفعہ ٹھوکر کھا کر گرے اور کاسک بریگیڈ کے سپاہیوں نے اُنہیں کوڑے مار مار کر اُٹھایا۔

ابھی یہ سب باغ شاہ میں نہیں پہونچے تھے کہ کاسک بریگیڈ کے سپاہیوں اور بدمعاشوں کے ایک ہجوم نے حملہ کر کے پھر سب گرفتار شدگان کو بہت زدوکوب کیا۔ اسی درمیان میں کسی نے چلّا کر کہا "ان کو قتل نہ کرو، ان سے بہت سے راز معلوم ہونگے" یہ سن کر سب الگ ہو گئے اور ان سب کو ایک خیمہ میں پہنچا دیا گیا۔

شام کو ملک المتکلمین اور قاضی قزوینی کو "لیاخف" کمانڈر انچیف کے پاس لے کر گئے۔ لیاخف نے کہا "ملک المتکلمین! کیا تم بھول گئے کہ کتنی مرتبہ

میری جانب سے اور روسی سفارتخانہ کی طرف سے تم کو یہ پیغام ملا کہ اس طریقۂ کار کو جو تم نے اختیار کیا ہوا ہے، چھوڑ دو اور شہنشاہِ روس کی مخالفت، جو دشمنی کی حد تک پہنچ چکی ہے، ترک کر دو اور ہماری دوستی اختیار کر لو۔ اب تمہارا انجام سوائے اس کے اور کیا ہو گا کہ تم کل قتل کر دیئے جاؤ گے اور اپنے کئے کا نتیجہ بھگت لو گے۔"

لفٹیننٹ عبداللہ کا بیان ہے کہ ملک المتکلمین کو اس حالت میں لایا گیا تھا کہ ان کا بدن زخموں سے چور تھا، ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے چہرے پر جلالت اور قوتِ ایمان کے ساتھ شجاعت کے ایسے آثار نمایاں تھے کہ خود لیاخف بھی اُن کے چہرے کی یہ کیفیت دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

ملک المتکلمین کسی بات کا جواب دیئے بغیر آسمان کو دیکھتے رہے اور بجائے لیاخف کی طرف دیکھنے کے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

"جان کی قربانی عشق کے راستے میں پہلی منزل ہے۔"

اس کے بعد سب گرفتار شدگان کو خیمے سے باہر لائے اور ایک خالی کمرے میں بند کر کے قفل لگا دیا گیا۔ ملک المتکلمین زنجیر کے سرے پر تھے اور اُن کے صاحبزادے محمد علی ملک زادہ زنجیر کے آخری سرے پر۔ محمد علی بار بار اپنے والد کو تکلیف کی حالت میں دیکھ کر کڑھ رہے تھے۔ تمام قیدی کھردرے فرش اور ٹھنڈی زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔

ملک المتکلمین کی تلقینِ صبر

ملک المتکلمین نے اس وقت عجیب و غریب صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ "ہم خدا کی راہ میں اور قوم کی خدمت کے لئے ان مصائب کا سامنا کر رہے ہیں ہمیں خدا کے ہاں اس کا اجرِ عظیم ملے گا۔ تمہارے لئے یہ مناسب ہے کہ ایسی شجاعت اور جان بازی کا ثبوت دو کہ لوگ پچھلی تمام قربانیوں کو بھول جائیں اور تمہارا ذکر دشمنوں کے ذکر کے مقابلہ میں اچھے الفاظ میں کریں۔" اس کے بعد فرمانے لگے۔ "کل میں اور مرزا جہانگیر خان قتل کر دیئے جائیں گے۔ انہیں تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، تم سب زندہ رہو گے اور میں امید رکھتا ہوں کہ جس دن کی ہم تمنا کر رہے تھے وہ دن تم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ تم آزادی کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو گے۔ مجھے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں ہے اس لئے کہ میری زندگی تو خاتمے پر آپہنچی ہے، مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے ملک کی بہتری کے لئے کیا۔ اور اب میں مشروطیت اور آزادی کی کھیتی کی آبیاری اپنے خون سے کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ایک دن وہ آئے گا کہ جب میرا اور شہدائے راہِ آزادی کا خون رنگ لائے گا اور ایران کو پُر بہار کر دے گا۔ میں محض مرزا جہانگیر خان کی وجہ سے فکر مند ہوں اس لئے کہ یہ تو ابھی جوان ہے۔ اگر زندہ رہ جائے تو آزادی اور مشروطیت کی بہت خدمت کرے گا۔"

ظہیر السلطان کا بیان ہے کہ اس رات ملک المتکلمین نے اس قدر اطمینان قلبی کا مظاہرہ کیا کہ ہم سب حیران رہ گئے۔

اپنے ایک ساتھی سے فرمانے لگے کہ "وہ آدمی جن کی سطح تفکر اور تعقل دوسروں سے

ہوتی ہے۔ وہ خلقِ خدا کی نجات کے لئے کمر ہمت باندھ لیتے ہیں اور وہ ہمیشہ قسم کی مصیبتوں کا شکار رہے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ شعر عجیب کیفیت سے پڑھا۔

کاش کشادہ نبود چشمِ من و گوشِ من
دشمنِ جانِ من است عقلِ من و ہوشِ من

آقائے طالقانی نے بیان کیا کہ ملک المتکلمین ہماری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے اے میرے ساتھیو! بالفرض اگر ہم چند سال زندہ بھی رہیں پھر بھی آخر موت ہے۔ لہذا عزت و افتخار کے ساتھ کیوں نہ دنیا سے جائیں اور وہ دن نہ دیکھیں جو یہ ظالم اور بے عقل بادشاہ دوسری حکومتوں کے کہنے میں آ کر لا رہا ہے۔"

ملک المتکلمین کی وصیت

وہ رات چونکہ ملک المتکلمین کی زندگی کی آخری رات تھی۔ اس لئے اپنے دوستوں کے بعد اپنے بیٹے محمد علی ملک زادہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: "کیا ہم نے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ ہم اپنی جان اور مال و عیال کو آزادی اور حق و انصاف کے راستے میں قربان کر دینگے۔ اب اُس کے ایفاء کا وقت آ گیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے حصہ کے مطابق مصیبتیں برداشت کرے۔

میرے بیٹے! توجہ سے سنو! اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے یاد رکھو۔ میں تم کو وصیت کر رہا ہوں کہ تمہارے بھائی بیروت میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اُن کو میری طرف سے لکھ دینا کہ وہ پوری توجہ کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کریں اس لئے کہ جو مصیبت ہم پر آئی ہے وہ جہالت کا نتیجہ ہے۔ جب تک علم و دانش کا نور

آدمیوں کی روحوں اور دلوں کو روشن نہیں کرے گا۔ وہ اپنی زندگی اندھیرے اور جہالت میں بسر کریں گے۔ اور ان کی حالت نہیں بدلے گی۔ میری روح اس انتظار کرے گی کہ تم اپنے باپ کے طریقۂ زندگی پر عمل کرو گے اور اپنی تمام کوششیں ملک و ملت کی خدمت کے لئے وقف کر کے مشروطیت اور آزادی کو ہمیشہ برقرار رکھو گے۔ تمہاری ذات ایران کے لئے ہونی چاہیئے نہ کہ ایران کی سرزمین تمہارے لئے۔ مجھے امید ہے کہ اس سربلندی اور شرافت و عدل کے جھنڈے کو اسی طرح بلند رکھو گے جس طرح میں نے بلند رکھا ہے۔ اور اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہو کر میری روح کو خوش کرو گے۔

میرے فرزند! مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خوشی اور مسرت کے دن آنے والے ہیں۔ عنقریب آزادی کا آفتاب ایران کے افق سے طلوع ہوگا اور اپنے نور سے تمام تاریکیوں کو پاک کر دے گا۔

آنے والی نسلیں میری اس جانفشانی کی قدر کریں گی اور میری خدمات کے باعث آزادی خواہ تمہاری قدر و منزلت کریں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم بھی پاکیزہ زندگی بسر کرو اور ایران کی محبت دل سے نہ نکالو اور اپنے باپ کی مانند اپنے آپ کو ابنائے وطن کی خدمت میں مشغول کرو۔''

ابھی یہ گفتگو تمام نہیں ہوئی تھی کہ کاسک بریگیڈ کا ایک افسر آیا۔ کہ ملک المتکلمین اور مرزا جہانگیر خان کو لے جائے۔ بڑی مشکل سے قفل توڑا گیا اور انہیں زنجیر سے نکالا گیا۔

دوسرے قیدیوں کے تاثرات ملک المتکلمین کے متعلق

محمد علی ملک زادہ نے دریافت کیا: آپ کو کہاں لے کر جا رہے ہیں؟۔ انہوں نے اس اطمینان کے ساتھ جواب دیا کہ ہمیں قتل کرنے کے لئے جا رہے ہیں اس کے بعد دوسرے قیدیوں کی طرف منہ کر کے کہا۔

"خدا حافظ"

شاہزادہ ناصر الملک (جو زنجیر کے درمیانی حصّے میں تھے) نے چاہا کہ وہ اپنے آپ کو ملک المتکلمین کے پاؤں پر گرا دیں لیکن زنجیر مانع رہی۔ تاہم انہوں نے ان کے دامن کو پکڑ کر بوسہ لے ہی لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو اس طرح جاری تھے جو تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

سلطان العلماء خراسانی نے بلند آواز سے کہا: "وَيَا لَيْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ وَنَفُوزُ فَوْزًا عَظِيمًا۔"

بادشاہ کے سامنے پیشی

ملک المتکلمین اور مرزا جہانگیر خان دونوں کو فوج کی دونوں صفوں کے درمیان سے نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ شیخ الرئیس ابوالحسن میرزا نے حسب ذیل واقعہ کو شہدائے راہِ آزادی کی مجلس فاتحہ کے موقع پر بیان کیا ہے:۔

"بادشاہ نے ملک المتکلمین سے اس موقع پر جو گفتگو کی اس سے بادشاہ کی کمینگی، کم ظرفی اور ملک المتکلمین کی قوتِ ایمان کا پتہ چلتا ہے۔ بادشاہ غرور کے نشہ میں مست، آزادی کے دشمنوں کے ہجوم میں، فتح سے سرشار اور اپنے وطن کی تباہی پر نازاں اور نہتے لوگوں پر سنگین کی قوت اور زور سے غلبہ پا کر فخر

کے ساتھ کرسی پر جلوہ گر تھا۔ اُس نے ملک المتکلمین کو دیکھتے ہی کہا۔

"تم نے ایران کی اس سلطنت میں جو دو ہزار سال سے بادشاہوں کے زیر سایہ امن و چین سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ فساد برپا کیا۔ رعایا میں بغاوت کے آثار پیدا کئے۔ حکومت اور سلطنت کے کاموں میں دخل دیا اور مشروطہ کو جس کے تمام علمائے روحانی خلاف تھے، جاری کر دیا۔ تمہارا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ مزدک کے دین اور بابیت کو جاری کرو اور مشروطہ کے باعث ہماری سلطنت ختم کر دو۔ یہاں تک کہ تم نے میری جان لینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ میں نے تمہیں سمجھایا لیکن تم باز نہ آئے۔ حکومت کا لالچ بھی دیا۔ زر پیسہ دے کر تمہیں دُنیا سے بے نیاز کرنا چاہا۔ لیکن تم نے ایک نہ سنی۔ میں تو اس امر پہ بھی تیار تھا کہ تم ایران سے باہر چلے جاؤ۔ لیکن تم اس کے لئے بھی تیار نہ ہوئے یہاں تک کہ یہ دن آپہنچا۔ لہٰذا میں بھی تمہیں وہ بدترین سزا دوں گا کہ تمہارے قتل سے سرکشوں کو عبرت حاصل ہو اور وہ سمجھ لیں کہ بادشاہوں سے مقابلہ کس قدر سخت چیز ہے۔ اور لوگ سمجھ جائیں کہ اُس حق کا مقابلہ کرنے سے جو خدا نے ہمیں عطا کیا ہے اُن کا کیا انجام ہو گا۔"

ملک المتکلمین کا جواب

ملک المتکلمین نے اپنے مضبوط ارادے کے ساتھ اس طرح جواب دیا کہ ان کے چہرے سے کہیں خوف کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ "اے بادشاہ! میری پوری زندگی اس فکر میں بسر ہوئی کہ میں سلطنت ایران کو جہالت اور تاریکی اور گمراہی سے نکال دوں اور ایران کو مہذب ملکوں کی صفوں میں لا کھڑا کر دوں۔

مشروطیت کے لئے میری کوششیں محض اسی لئے تھیں کہ بادشاہ کو عظیم الشان بادشاہوں کی صفوں میں شامل کر دوں تاکہ ہمارا ملک متمدن ملکوں کی طرح ترقی حاصل کرے اور چونکہ قوم کی ترقی علم اور عدل کے جھنڈے کے نیچے آنے پر منحصر ہے اور علم کا پھیلنا عقل و دانش کے پھیلنے کے مترادف ہے۔ اس لئے میں نے بھی وہی راستہ اختیار کر لیا جس میں بادشاہ کی نیک نامی اور قوم کی بہتری مضمر تھی۔

اگر میں نے اس راستہ کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کیا ہو۔ اور اگر میں نے بے عقل درباریوں اور چاپلوسوں سے عدم توجہی نہ کی ہو جن کا مقصد سوائے بادشاہ کو غلط راستوں پر ڈالنے کے اور کچھ نہیں ہے تو یقیناً میں نے تجھ جیسے بادشاہ سے، جس کے سامنے سعادت اور شقاوت کے دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں، میں نے خیانت کی۔

اس لئے کہ اگر ملک ترقی یافتہ ہو جائے اور دنیا اس کی محیر العقول ترقیوں سے حیران ہو جائے تو اس میں تو بادشاہ کا فائدہ اور دنیا کے سامنے اس کے افتخار میں اضافہ کرنا ہی مقصود تھا۔"

ملک المتکلمین نے زخمی مرزا جہانگیر خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا تیری سلطنت میں رہنے کا یہی پھل ہے اور کیا تیرا ایرانی قوم پر حکومت کرنے کا مقصد یہی ہے کہ تو اس طرح لوگوں کے ساتھ سلوک کرے جس طرح یہ شخص تیرے سامنے کھڑا ہے۔ کیا یہی تقاضائے عدل و انصاف ہے؟ کیا یہی ان قسموں کا احترام ہے جو تو نے بار بار کھائیں؟ کیا یہی اُن قسموں کا صلہ ہے جو تو دے رہا ہے؟ تو نے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے، بلکہ حکم صادر کر دیا ہے۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ

میرے قتل سے تجھے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ میرے خون کے ہر قطرہ سے ایک ایک ملک المتکلمین وجود میں آئے گا جو مشروطیت اور انصاف کے پرچم کو بلند کرے گا۔"

محمد علی شاہ اس آخری جملہ سے اس قدر برافروختہ ہوا کہ اس نے چلا کر کہا میں تجھ کو اس طرح قتل کراؤں گا کہ تیرے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرے گا۔

حکم موت

اس کے بعد اس نے حاجب الدولہ اور جلاد کو حکم دیا کہ لے جاؤ ان دونوں کے گلے میں رسی ڈال کر کھینچ دو۔ اس کے درخت سے باندھ دو اور پیٹ پھاڑ دو اور دل کو چیر کر میرے پاس لاؤ کہ میں یہ دیکھوں کہ اس کا دل آخر کس چیز کا بنا ہوا ہے جو اس قدر جرأت اور گستاخی کر رہا ہے۔

تمام لوگوں نے بیان کیا کہ ملک المتکلمین اس اطمینان اور ثابت قدمی سے موت کا استقبال کرنے کے لئے جا رہے تھے کہ گویا یہ آیہ شریف "یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" ان ہی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

عبدالکریم افسر افواجِ شاہی نے کہا کہ ملک المتکلمین بار بار آسمان کی طرف دیکھتے جا رہے تھے اور انہیں اپنے گرد و پیش کی خبر نہ تھی۔ جب اُن دونوں مظلوموں کو قتل گاہ میں لے کر آئے تو ملک المتکلمین نے اپنے اطراف پر نظر ڈالی اور ایک پُر درد آواز کے ساتھ اس شعر کو پڑھا۔

با بارگہ دادیم، ایں رفت ستم بر ما
تا خود چہ رسد خذلان، بر قصر ستمکاران

آخری وقت میں مرزا جہانگیر خان سے ملنا چاہا۔ لیکن معانقہ نہ کر سکے اور آہستہ سے

تھا۔ ہم دوسری دنیا میں جا کر مل جائیں گے۔"

جلادوں نے وہ ریشمی رسی جس کا ایک سرا توپ سے باندھ دیا گیا تھا۔ ملک المتکلمین کی گردن میں ڈال دی اور رسی کے دوسرے سرے کو انہوں نے زور سے کھینچ لیا اور جب ان کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا تو جلاد نے وہ خنجر ان کے سینے میں گھونپا جو محمد علی شاہ نے اس کو اس مقصد کے لئے دیا تھا اور جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی شاہ کی دشمنی ان کے ساتھ کس قدر زیادہ تھی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

ان کی لاش ایک خندق میں ڈال دی گئی۔ آدھی رات کو بعض جانبازوں نے بے پناہ خطرات کی موجودگی میں ان کی لاش نکال کر قریب کے قبرستان میں دفن کر دی۔

۵ بعد از وفات تربت ما در زمین مجو

در سینہ ہائی مردم عارف مزار ماست

ملک المتکلمین کی اس دردناک موت کے واقعات سے لوگوں کے دل لرز گئے دنیا کی تمام خبر رساں ایجنسیوں نے اس واقعہ کو بہت تفصیل سے لکھا۔ دنیا کے اخباروں اور دوسرے ملکوں کے سفیروں خصوصاً برطانیہ کے سفیر نے اس سلسلہ میں سخت احتجاج کیا اور محمد علی شاہ کو اپنے زمانہ کا "چنگیز" کہا۔

فرانس کے ایک اخبار نے تو المناک اداریہ میں یہ لکھا کہ ان کے ساتھ وہی ہوا جو حضرت عیسیٰ کے ساتھ ہوا تھا۔ فرانس کے ایک اور اخبار نے ان کی شہادت کی تصویر پہلے صفحہ پر شائع کی۔ روزنامہ ٹائمز لندن نے ایران کو ایک

"وحشی ملک" کہا۔ مصر کے مشہور اخبار "المنار" نے اس حادثہ کی پوری تفصیل شائع کی۔

اب ان مرثیوں اور قصیدوں میں سے نمونہ کے طور پر چند ایک پیش کئے جاتے ہیں جو ملک المتکلمین کی شہادت پر لکھے گئے۔

آقای معظم السلطنۃ، جو باغ شاہ میں قید تھے اور جنہوں نے خود بہت سی تکلیفیں اٹھائی تھیں، اور دوسروں کو تکلیفیں اٹھائی تھیں اور دوسروں کو تکلیفیں اٹھاتے دیکھا تھا۔ اس طرح کہا:-

چون مجلس شوریٰ شد با توپ ستم ویران
گردید اسیر جنگ یک نابغہ دوران
بر خیل سخن سنجان در رتبہ (ملک) بودی
مانندۂ او ناطق نادیدہ بخود ایران
خود از فضلاء عصر مشہور (دہشتی) بود
ہم بر خطبا سرور (نصر اللہ) با ایمان
بر قاطبۂ احرار می بود مہین قاید
مفہوم وطن خواہی، آن جوہرۂ انسان
مجلس چون شدی محصور از خیل زایان دور
می بود ملک از خشم چون شیر ژیان غرّان
گاہی بخن می داد خود داد سخن رانی،
گاہی بعمل می کرد تشجیع، وزیٔ جولان

در مسجد و در مجلس احرار شدی مغلوب
چون تیرِ ستم بارید هر لحظه چنان باران
سیلاخوری و قزاق آماج ستم کردند
هر سو که بدست آمد از مردمِ والاشان
بردند (بباغِ شاه) سیلاخوریان نز احرار
سر بی کلَه و خونین پا برهنه و عریان
افتاد (ملک) دربند در چنگِ گروهی چند
ز اشرارِ ستم پیشه بی عاطفه و وجدان
در محنت و رنجِ او، گر ذرهٔ فلک می ریخت
از چشمِ ثریا اشک، هر دم به رخِ کیهان
شد وارد (باغ شاه) مغلولِ شه گمراه
رنج و غم و آزارش کی یافت دمی پایان؟
سر تا بقدم مجروح، مانندِ تنی بی روح
بر شاهِ ستم پیشه، گردیده شبی مهمان
با امرِ شهِ گمراه در مقتلِ (باغ شاه)
در پنجهٔ دژخیمان، در ظلمتِ آن زندان
چون گشت و را نوبت، بر قتل شدی دعوت
آمد بسوی مقتل با قاتل و زندانبان

چون از پیِ دیدارش استاد که تا بیند
کاین صیدِ حرم این دم چه نیک سپارد جان
دریافت (ملک) زآن سو، شه می نگرد بر او
آن مردِ سخن پرور از زجر شده نالان
با دست اشارت کرد، بر شاه حقارت کرد
کای شاه شده غافل از دایرهٔ یزدان
ما بارگهِ عدلیم این رفت ستم بر ما
بر قصرِ ستمکاران تا خود چه رسد خذلان"

....

بر گردنش افگندند یک رشتهٔ پرتابی
بی تاب و توان گردید چشمی چو مهِ تابان
آن رشتهٔ مستحکم، پُر حلقه و پیچ و خم
چون (ذو ذنبی) گردید بر گردن خود پیچان
وانگاه یکی جلاد بر او بنمود بیداد
بدرید شکم او را با خنجر کی بران
در عالمِ عُلوی شد وین دامگهِ سفلی
آن مردِ سخن پرور، وآن نادرهٔ دوران
تاریخِ وطن، باقی می دارد و محفوظش
اندر کنفِ یزدان، پاینده و جاویدان

وآن یار (جہانگیرش) ہم محبس و زنجیرش
گردید پس از نیز، در راہِ وطن قربان
بادا، بر وانِ او، بر نطق و بیانِ او
ہر لحظہ دو صد رحمت از بارگہِ منّان
این سانحہ را (ذولت) دیدی بعجم در دولت
خود بود بباغ شاہ مغلول و در آن زندان

(۲) ثابت اردستانی نے ان کی شہادت حسب ذیل قطعہ تاریخ نکالی ہے

از محمد علی شہِ قاچار — آن جفا کارِ سرکشِ مغرور
شدہ مقتولِ ظلم و استبداد — را د نصر اللہ آن خطیبِ غیور
چونکہ در بحرِ مغفرت شدہ غرق — ہست تاریخِ "قتل او مغفور"

۱۳۲۶ قمری

(۳) ۱۳۲۹ شمسی (سنہ ۱۹۵۰ء عیسوی) میں طہران میں ملک المتکلمین کی شہادت کی یادگار میں ان کا مجسمہ نصب ہونے کے موقع پر آقای نظام وفا نے حسب ذیل اشعار کہے۔

ہزار و سیصد با بیست بود در نہ مقتدرن
کہ این مجسمہ برپا شدہ بدستِ ہنر
گر از شرافت و مردانگی و دانش و داد
تو ان مجسمہ ای ساخت در جہانِ صور

بدین مجسمه بنگر که هست کالبدی
ز داد خواهی و جانبازی و فتوت و فر
ز پیکری بود این کالبد نمونه که بود
نمونه ای ز جهان و کمالِ آنِ پیکر
سپهر با همه رفعت دگر نخواهد دید
بزرگ منزلتی چون ملک بمدِّ نظر
کجاست آنکه چو او گلبنِ عدالت را
بخونِ خویش دهد آب و آورد بثمر

مرا بباغ شه از قهر چون فرو بستند
عجبی که نگشتش گشوده هرگز در
ز روزبانان روزی شنیدم این گفتار
که گفت این ز سرِ کین برای آن دیگر
بگفت خون چو شد از صورت ملک جاری
بگفت جائی چو بر فرق داردش خنجر
بروی من نگهی گرم کرد، و سوزان گفت
چنانکه لرزه بر اندامم اوفتاد و شرر
ز خونِ ناحقِ ما سیلها شود جاری
که کاخِ ظلم بهر جا کنند زیر و زبر
نظامِ خونِ کسی چون ملک نگردد خشک
که او شهامت و آزادگیست تازه و تر

باب ششم

میرزا جہانگیر خان شیرازی مدیر روزنامہ "صور اسرافیل"

نام :- میرزا جہانگیر خان ۔ باپ کا نام رجب علی تھا۔

پیدائش :- ۱۸۷۵ء میں شیراز میں پیدا ہوا۔

وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گیا اور اس کی تربیت اور کفالت پھوپھی اور دادی پر آئی۔

تعلیم :- پانچ سال کی عمر تھی کہ اس کی پھوپھی اور دادی اُسے طہران لے آئیں۔ اس نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور وہ چودہ سال کی عمر میں ۱۸۸۹ء میں شیراز دوبارہ واپس آیا۔ مفلسی کے باوجود شوقِ علم نے اس کو حصولِ علم پر مجبور کیا اور زمانہ کی سختیوں وسائل کی دقتوں کے باوجود ادبیاتِ فارسی وعربی اور منطق اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔

طہران میں آمد میرزا جہانگیر خان ۱۸۹۳ء میں واپس طہران آیا اور دار الفنون میں جدید علوم کے حصول میں مشغول ہوا۔ اس نے معاش کی تکلیفوں کے باوجود اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے زمانہ کے نامور ادیبوں میں شمار کیا جانے لگا۔

بدین مجسّمه بنگر که هست کالبدی
ز داد خواهی و جانبازی و فتوّت دفر
ز بیکری بود این کالبد نمونه که بود
نمونه ای ز جهان و کمالِ آنِ پیکر
سپهر با همه رفعت دگر نخواهد دید
بزرگ منزلتی چون ملک بمدِّ نظر
کجاست آنکه چه او گلبنِ عدالت را
بخونِ خویش دهد آب و آورد شجر

مرا بباغ شه از قهر چون فرو بستند
عجبی که نگشتش کشوده هرگز در
ز روز بانان روزی شنیدم این گفتار
که گفت این ز سرِ کین برای آن دیگر
بگفت خون چو شد از صورت ملک جاری
بگفت جائی چو بر فرق داردش خنجر
بروی من نگهی گرم کرد، دسوزان گفت
چنانکه لرزه بر اندامم اوفتاد دشرر
ز خونِ ناحقِ ما سیلها شود جاری
که کاخ ظلم بهرجا کنند زیر و بر
نظامِ خونِ کسی چون ملک نگردد خشک
کز او شهامت و آزادگیست تازه و تر

باب ششم

میرزا جہانگیر خان شیرازی مدیر روزنامہ "صور اسرافیل"

نام :- میرزا جہانگیر خان - باپ کا نام رجب علی تھا۔

پیدائش :- ۱۸۷۵ء میں شیراز میں پیدا ہوا۔

وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گیا اور اس کی تربیت اور کفالت پھوپھی اور دادی پر آئی۔

تعلیم :- پانچ سال کی عمر تھی کہ اس کی پھوپھی اور دادی اُسے طہران لے آئیں۔ اس نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور وہ چودہ سال کی عمر میں ۱۸۸۹ء میں شیراز دوبارہ واپس آیا۔ مفلسی کے باوجود شوقِ علم نے اس کو حصولِ علم پر مجبور کیا اور زمانہ کی سختیوں وسائل کی دقتوں کے باوجود ادبیاتِ فارسی و عربی اور منطق اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔

طہران میں آمد میرزا جہانگیر خان ۱۸۹۳ء میں واپس طہران آیا اور دار الفنون میں جدید علوم کے حصول میں مشغول ہوا۔ اس نے معاش کی تکلیفوں کے باوجود اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے زمانہ کے نامور ادیبوں میں شمار کیا جانے لگا۔

جس طرح ہر انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اُسی طرح میرزا جہانگیر خان کو بھی بچپن ہی سے زمانے کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔

استبدادیت کا دَور اُس نے اچھی طرح دیکھا تھا اور اس کی روز افزوں سختیوں کا حال سنا اور مشاہدہ بھی کیا تھا۔ اسی عرصہ میں آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی، وہ بھی آزادی خواہوں کے گروہ میں شامل اور آہستہ آہستہ اس تحریک میں اتنی سرگرمی سے حصہ لیا کہ وہ آزادی کے نامور لوگوں میں شمار ہونے لگا۔

میرزا جہانگیر خان کی پھوپھی بھی ایک دلیر خاتون تھی اور وہ بھی آزادی خواہوں کے ساتھ شامل ہو چکی تھی اور بقول ڈاکٹر مہدی ملک زادہ، مولف "تاریخ انقلاب مشروطیت ایران" اس خاتون کا گھر آزادی خواہوں کی مجلس کی جگہ اور ان کے خفیہ جلسوں کا مرکز تھا، اور وہ اسی سبب سے انقلابی پارٹی کے سربستہ رازوں سے کامل آگاہی رکھتی تھی۔

چنانچہ جب محمد علی شاہ اور قوم کے درمیان جنگ جاری تھی تو نہ صرف یہ کہ آزادی خواہوں کے جلسے اسی خاتون کے گھر میں ہوتے تھے، بلکہ اسی کے مکان میں آتشین اسلحہ اور بم تیار ہو کر رکھے جاتے تھے۔ غیر استعمال شدہ اسلحہ عرصۂ دراز تک ایک کمرہ میں رکھا رہا اور رضا شاہ کبیر کے زمانے میں نکال کر تباہ کیا گیا۔

اسی خاتون نے امیر بہادر جنگ کی دعوت میں مظفر الدین شاہ قاچار کو ایک خط دیا تھا اور چپکے سے مجمع میں غائب ہو گئی تھی۔ یہ امر تو آج تک راز ہی رہا کہ اس خط میں کیا لکھا ہوا تھا۔ لیکن اس خاتون کی طبیعت اور اس کے ماحول کا اندازہ لگا لینے کے بعد جو کچھ اس نے بادشاہ کو دیا ہو گا وہ ظاہر ہے اور بقول مویدالملک شیرازی، مصاحب

خاص، خط پڑھتے ہی بادشاہ کا رنگ اُڑ گیا، اُس نے وہ خط کئی مرتبہ جیب سے نکال کر پڑھا اور پھر اندر کی جیب میں رکھ لیا۔ جب میرزا جہانگیر خان کے گھر کا یہ ماحول ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ایسے ماحول سے کس قدر متاثر ہوا ہوگا۔

۱۷؍ جون ۱۹۰۵ء

۱۷؍ جون ۱۹۰۵ء کو میرزا سلیمان مے کدہ کے مکان پر ایک خفیہ جلسہ کیا گیا۔ اس جلسہ میں آزادی خواہوں کے رہنماؤں کے ساتھ میرزا جہانگیر خان نے بھی شرکت کی۔ اس جلسہ میں ہر شخص نے ایک ہاتھ میں سید جمال الدین واعظ کے ہاتھ سے تیار کیا ہوا ملّی پرچم لیا اور دوسرے ہاتھ پر قرآن مجید رکھا اور قسم کھائی کہ ہم اس پرچم کو اپنی پوری قوت کے ساتھ بلند رکھیں گے۔ اور تازیست اس کو سرنگوں نہ ہونے دیں گے۔

اس تاریخی جلسہ کے بعد ہی انقلابی کمیٹی وجود میں آئی جس کے ارکین کو انقلاب برپا کرنے کے متعلق جملہ اختیارات تھے۔ اور میرزا جہانگیر خان ان میں سے ایک تھا۔ آزادی کے پروانوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ بلند مقاصد کو اپنے سامنے رکھا اور کسی مرحلہ پر بھی اِن سے بلا واسطہ یا بالواسطہ کوئی ایسا عمل سرزد نہیں ہوا جو اِن کے مفاد کے خلاف ہو۔ ان کا تعلق بادشاہ کی ذات سے تھا اور وہ اس کو بھی آئینی بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لئے اگر کسی موقع پر بادشاہ کی طرف سے کبھی تعاون کا ثبوت مل جاتا تھا تو وہ عام جلسوں میں بھی اس کی تعریف کئے بغیر نہ رہتے تھے۔

مہاجرتِ کبیر

۱۲؍ جنوری ۱۹۰۶ء کی مہاجرتِ کبیر میں دوسرے مہاجرین کے ساتھ میرزا جہانگیر خان بھی قم گیا اور انہیں کے ساتھ واپس آیا۔ واپسی

پر میرزا جہانگیر خان ملک المتکلمین اور سید جمال الدین واعظ کا مشیر رہا اور آزادی خواہوں کے ہر جلسہ میں شرکت کرتا رہا۔ آزادی خواہوں کا مطالبہ یہ تھا کہ ملک میں حکومتِ مشروطہ یا پارلیمنٹری حکومت قائم کی جائے اور اسی مقصد کے حصول کے لئے وہ مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔

۱۹۰۶ء میں آزادی خواہوں کا مطالبہ منظور ہوا اور مظفرالدین شاہ نے حکومتِ مشروطہ کی منظوری دیدی۔ ۱۹۰۷ء میں مظفرالدین شاہ کی وفات پر جب اُس کا بیٹا محمد علی تخت نشین ہوا تو وہ حکومتِ مشروطہ کا سخت مخالف ہوگیا اور جوں جوں وقت گذرتا گیا اُس کی مخالفت آزادی خواہوں سے بڑھتی گئی۔ وہ اپنی آسائش کی خاطر ایرانی قوم کی زندگی کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ اُدھر آزادی خواہوں کی تعداد کم اور بادشاہ کے طرفداروں کی تعداد زیادہ تھی۔ محمد علی شاہ روسیوں کے اشاروں پہ کام کر رہا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن سے ایران کے آزادی خواہ گذر رہے تھے۔

اسی زمانے میں میرزا قاسم خان صور نے ایک اخبار نکالا جس کا نام "صوراسرافیل" رکھا گیا۔ اس اخبار کا اجراء ۳۰ مئی ۱۹۰۷ء کو عمل میں آیا اور اس کی ادارت میرزا جہانگیر خان کے سپرد کی گئی۔

اس اخبار نے اپنی روش سب سے علیحدہ اختیار کی اور انشائے جدید کو رواج دیا اسی نے لوگوں میں انشاء کا صحیح مذاق پیدا کیا اور تاریکی اور جہالت کے وہ پردے اُٹھ گئے جنہوں نے عمومی افکار کو ڈھانپ لیا تھا۔

اس اخبار میں ایران کی سیاسی حالت کا دوسرے ملکوں کی سیاسی حالت سے مقابلہ کیا جاتا اور وطن کی حالت درست کرنے کے لئے اس اخبار میں اس طرح کے مقالات

شائع ہوتے تھے جن کی مثال دوسرے اخباروں میں نہیں ملتی تھی۔

چونکہ حقیقت کا اظہار کرنے والے لوگ ہمیشہ ارباب حکومت کی نگاہ میں کھٹکتے رہے ہیں، اسی طرح میرزا جہانگیر خان کا نام بھی حکومت کے مخالفین میں آ گیا اُدھر ظاہر پرست علماء نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اگرچہ "صورِ اسرافیل" کی عمر بتیس ۳۲ اشاعتوں تک محدود رہی لیکن اس عرصہ میں اُس نے بادشاہ پر اس قدر تنقید کی کہ وہ اس کے مدیر میرزا جہانگیر خان کا سخت دشمن ہو گیا۔

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" جلد چہارم میں صفحہ ۲۱۵ پر لکھا ہے کہ یہ انقلاب کے دوران بہترین اخباروں میں سے تھا۔ اور خصوصاً اس کا خاص کالم "چرند و پرند" فارسی نثر کا بہترین نمونہ تھا۔ یہ کالم اس اخبار کا ایسا نادر حصہ تھا جس میں طنزیہ زبان میں ملک کے حالات پر تبصرہ ہوتا تھا اور امثال و حکایات کے ذریعہ اُن پر سخت تنقید ہوتی تھی۔ اس مخصوص کالم کے لکھنے والے (علامہ) میرزا علی اکبر خان دہخدا تھے جو "دخو" کے مستعار نام سے لکھا کرتے تھے۔

"دخو" چھوٹے چھوٹے فقروں میں وہ نشتر چبھوتا جو اپنی تاثیر کے لحاظ گہرا اثر چھوڑتے۔ تحریر کے دوران میں وہ اکثر عوام کی زبان استعمال کرتا۔ وہی کلمات، وہی ترکیبیں، وہی روزمرہ، وہی محاورے ہوتے جن کو عام لوگ بولتے۔ بلکہ بعض جگہ تو اس کثرت سے روزمرہ کا استعمال کیا ہے کہ جو شخص اس کی طرزِ تحریر سے واقف نہ ہو وہ اس کا مطلب سمجھ ہی نہیں سکتا۔

بلکہ دخو کی تحریر کی ندرت اور تازگی اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے البتہ جو شخص اس کی طرزِ فکر اور اس عہد کے حالات سے جو کہ پس منظر ہیں پوری طرح واقفیت رکھتا ہے وہ نہ صرف اس کی بے نظیر عبارت سے محظوظ ہوتا ہے بلکہ اس کی لسانی خوبیوں کا بھی معترف ہوتا ہے۔

میرزا علی اکبر خان دہخدا نے چونکہ سیاسیات کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا اس لئے وہ اپنی طنزیات کے ذریعہ جو اکثر مکالمہ کی صورت میں ہوتی تھیں، لطیف انداز میں بادشاہ اور اس عہد کے سیاسی حالات پر بے لاگ تبصرہ کرتے تھے۔

"دخو" کا مقصد یہ تھا کہ وہ بادشاہ کے مظالم کو اس طریقہ سے پیش کرے کہ لوگوں کو آزادی خواہی کے مقصد سے ہمدردی پیدا ہو اور اس نیک مقصد میں وہ زیادہ سے زیادہ اتحاد سے کام لیں۔ وہ جابر بادشاہ کی سختیوں اور ظالم حکام کے مظالم کو اس انداز میں پیش کرتا تاکہ وہ ظلم کے نتائج سے مطلع ہو کر اپنے ظالمانہ رویوں کو ترک کر دیں۔

"چرند و پرند" کے کالموں کی وجہ سے "صورِ اسرافیل کی مانگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ اگر وہ صبح کو چار شاہی (دو پیسے) میں فروخت ہوتا تھا تو عصر کے وقت چند تومان (چند روپے) میں بھی مشکل سے دستیاب ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس "چرند و پرند" کے کالموں اور میرزا جہانگیر خان کے مقالوں نے جدید فارسی نثر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ طنزیہ اور بیباکانہ انداز تحریر سے لوگوں میں معاملہ فہمی کا شعور پیدا کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اخبار قوم کا نباض تھا جس نے استبدادیت کی
تی ہوئی رگ کو پکڑا۔ اور اس پرآشوب زمانہ میں حکومت کی کڑی
ہوں کے باوجود تمام واقعات کو اس طرح سے پیش کیا جس سے عوام
شنا تھے۔ ذیل میں اس کے اداریہ کی چند سطریں اس لئے پیش کیجاتی
تاکہ اس کے اندازِ تحریر کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

"یا مرگِ با شرف۔ یا زندگی با افتخار"

ای ایران! ای مادرِ پیری! کہ سالیانِ دراز از خونِ عروق و
شرائینِ خود ما را شیر دادی، و از گوشتہای بدنِ خویش بتغذیۂ
بدنِ ما پرداختی! آیا ما باز زندہ خواہیم ماند و فرزندانِ ناخلف،
تو دامنِ عصمتِ ترا بدستِ اجانب خواہند داد؟ آیا چشم ما
خواہد دید کہ حجابِ عفتِ ترا خارجیہا می درند؟ حاشا و کلا!
این نخواہد شد۔

قسم بخداوندِ جبار و منتقمِ قہار! ہنوز خونہای معاصرینِ ضحاک
در شرائینِ ما جاریست و ہنوز احساساتِ مردانِ عہدِ قباد و خسرو
و نادر و آقا محمد خان در اعصابِ ما متمکن می باشد ببین کہ سرہای
ما چگونہ بہ ابدان سنگینی می کند، ببین کہ دلہای ما چسان در سینہ
ہا می طپد۔ ببین کہ بازوہای ما از کسالتِ صلح جوئی تا چہ
حد خستہ شدہ است۔ ببین کہ سینہ ہای ما برای نفس و ابدانِ
ما برای ارواح تنگ گردیدہ، چرا؟

زیرا که چشمهای غضب آلودِ پدرانِ خود که از آسمانها خیره بما می نگرند، می بینیم - زیرا که ملامتهای آنان نسبت به بی تعصبی های خود در حفظِ وطن یعنی خونهای اجدادِ خویش می شنویم. بابا پنجهزار سالِ تجربه و دو سال جان بازی و دادنِ جانِ پاک و صرفِ میلیونها مال و وقت آخرالادوای ضعف و رنجوری ترا تحصیل کرده و در تحتِ نام نامی شورای ملی برای تو آماده کرده ایم. بگیر و بنوش، و جوانی را از سر شروع کن، و بتربیت فرزندانِ خویش بپرداز - آنکه می گوید، من این جام حیات از کفِ این محتضر گرفته بر زمین خواهم ریخت - او از دنائت نسب و پستیٔ مولدِ خویش خبر می دهد - او از قدرتِ قدمتِ تاریخ و نجابتِ ملی و شرافتِ نسبی بی اطلاع است - خلل در ارکانِ مجلسِ شوریٰ با حیاتِ آخرینِ طفلِ نابالغ ملتِ ایران مباینت دارد - امروز اولادِ ایران از سرحدِ بلوچ تا آذربائیجان و از اطرافِ شط العرب تا خراسان در تاریکیٔ هر جنگل، در صفای هر جلگہ، در قلۂ هر کوه، در عمقِ هر درّه، بغرشِ رعد و صولتِ شیر فریاد می زند - مرگ نیست جز نقل و تحویل - زندگی نیست جز میدانِ جنگ - غنیمت نیست جز کسبِ شرافت و تحصیلِ افتخار - آنکه مجلسِ شوریٰ ندارد، وطن ندارد - آنکه وطن ندارد، شرف ندارد، و آنکه شرف ندارد، مرگ برای او هزار بار از زندگی

شرین تراست۔ ۳ (شمارۂ ہیجدۂ صور اسرافیل)

خصوصیات صورِ اسرافیل

(۱) صورِ اسرافیل میں ان موضوعات پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی جن کا تعلق عوام سے تھا۔

مثلاً ایک زمانہ میں روٹی کی کمی ہوگئی تو صورِ اسرافیل میں "چرند و پرند" کے عنوان کے تحت طنزیہ انداز میں حکامِ وقت کے طریقۂ انتظام پر بحث کی گئی۔

(۲) "صورِ اسرافیل" میں مشروطہ کے مفہوم کو واضح انداز میں پیش کیا گیا۔ پہلے مشروطہ کا مطلب لوگ محض شریعت طلبی سمجھتے تھے نہ کہ وطن پرستی۔

"صورِ اسرافیل" نے اس دورنگی کو دور کیا۔ اس نے جس نقطۂ نظر کو پیش کیا، اس کو برابر قائم رکھا اور اپنے مقالوں میں تاریخ یورپ کے حوالے بھی دیتا رہا۔

اس کا آخری شمارہ ۲۰ رجون ۱۹۰۸ء کو نکلا۔ اس کے بعد میرزا جہانگیر خان کے ساتھ اس اخبار کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

یہی سبب تھا کہ بادشاہ نے پارلیمنٹ کو تباہ کرنے سے قبل جو چیلنج آٹھ آدمیوں کی گرفتاری کے لئے بھیجا تھا اس میں میرزا موصوف کا بھی شامل تھا۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خود میرزا جہانگیر خان کو بقول مستشار الدولہ اس بات کا علم نہیں تھا یا وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ بادشاہ فوج کی قوت کے ساتھ غلبہ حاصل کرکے آزادی خواہوں پر اس قدر سختیاں روا رکھے گا۔

اپنے خیال میں میرزا جہانگیر خان نے ایرانی قوم کو حلال زادہ کہہ کر

اُن کی تعریف کی اور کہا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سادات بنی فاطمہ اور علمائے واجب الطاعۃ پر گولی چلائیں اور چھ تومان کے لئے لوگوں کا خون بہائیں۔" اس کے بعد کاسک بریگیڈ کے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا ہے " اگر تم اس قدر سنگدلی کا اظہار کرو گے تو ہم بھی فداکاری میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھیں گے اور ہم کبھی یہ نہ کہیں گے کہ ہم مغلوب ہو گئے اس لئے کہ ہمارے برادر بھائی آذربائیجانی، گیلانی، فارسی، اصفہانی مدد کو آرہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے بدنوں کو ان مہمانوں کے گھوڑوں کے سم کے نیچے کچل دیں اور شہر تہران کو ان مقدس مہمانوں کی آمد کے موقع پر اپنے خونِ گلو سے زینت دیں اور اب اُن مہربان بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہم ہیں شہدائے راہِ آزادی کے پیش رو، ہم ہیں اولین حامیانِ اسلام، ہم اپنے مقدس مہمانوں کی آمد کے موقع پر اپنی جانوں کو قربان کرتے ہیں اور زندگی کے ماحضر کو اخلاص کی کشتی میں لگا کر پیش کرتے ہیں۔"

انہدام پارلیمنٹ پارلیمنٹ کی تباہی کے بعد ۲۳ رجون ۱۹۰۸ء کو میرزا جہانگیر خان کی گرفتاری ملک المتکلمین کے ساتھ امین الدولہ پارک کے ساتھ ملحقہ مکان میں ہوئی۔ ان دونوں پر جو ظلم و ستم ہوئے اس کا تذکرہ ملک المتکلمین کے بیان میں ہو چکا ہے۔ گرفتاری کے بعد ان کو زنجیروں میں باندھ دیا گیا تھا۔

میرزا علی اکبر خان دہخدا نے بیان کیا کہ گرفتاری کے بعد میرزا جہانگیر خان برطانوی سفارت خانہ کے پاس سے گزرے تو وہاں کے عملے کے لوگوں کے

سامنے جو ان قیدیوں کو دیکھنے کے لئے کھڑے تھے، اس نے چلا کر کہا "ما آزادی خواہانیم" (ہم آزادی چاہنے والے ہیں) سپاہی نے پیچھے سے آکر زور سے مُکا مارا۔ مُکہ کے لگتے ہی میرزا کے منہ سے خون جاری ہوگیا۔ میرزا کی بات نامکمل رہ گئی اور قیدیوں کو کاسک بریگیڈ کی فوجی بارکوں میں لے گئے بارکوں میں مقیم سپاہیوں نے آتے دیکھا تو سب ان کے سامنے آگئے۔ ان کا مذاق اڑایا گیا، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں نے ان پر تھوکا۔ سپاہی آتے ان کو گالیاں دیتے اور چلے جاتے۔

وہاں سے اس کو دوسرے گرفتار شدگان کے ساتھ باغ شاہ میں لے گئے اور ایک کمرہ میں بند کردیا۔ رات انتہائی تکلیف سے گزاری۔ صبح کو شاپشال کے سامنے پیشی ہوئی تو اس نے کہا "تم نے اپنے اخبار میں لکھا کہ میں یہودی ہوں۔ میرزا جہانگیر خان نے جواب دیا کہ "میں نے تو وہی لکھا جو سب لوگ کہتے تھے۔" شاپشال نے کہا "کل تمہیں سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔" میرزا جہانگیر خان نے جواب نہیں دیا لیکن حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

اگلے دن ملک المتکلمین کے ساتھ بادشاہ کے سامنے پیشی ہوئی۔ اور بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

ملک المتکلمین کا گلا گھونٹنے کے بعد میرزا جہانگیر خان کو کشاں کشاں لے گئے اور اس کے گلے میں بھی رسی ڈال کر اس شہید راہِ آزادی کو زندۂ جاوید بنا دیا گیا۔

مرنے کے بعد اس کی لاش ایک خندق میں ڈال دی گئی۔ لیکن آدھی

رات کو بعض جانبازوں نے ان تمام خطرات کی موجودگی ملک المتکلمین کے ساتھ میرزا جہانگیر خان کی لاش بھی نکالی اور قریب کے قبرستان میں دفن کردی۔ اس کا مزار بعد میں زیارت گہ خاص و عام بن گیا۔ اور بقول شاعر ؎

قسمت کی بات ہے یہ ملا جس کو مرتبہ
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن نہیں

باب ہفتم

سید جمال الدین واعظ اصفہانی

نام — سید جمال الدین معروف بہ واعظ۔

سنہ ۱۸۶۱ء میں ہمدان میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام آقا سید عیسیٰ تھا۔

بچپن — ان کے والد بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ طہران لے آئیں، پانچ سال کی عمر تھی کہ وہ مکتب میں داخل ہوئے انہوں نے معمولی سی تعلیم حاصل کی تھی کہ ان کی ماں نے اپنے بہنوئی کے پاس ٹوپیاں بننے کا کام سیکھنے کے لئے بھیج دیا۔ چودہ سال کی عمر تک اس کام میں مشغول رہے۔

۵۔ تاریخ انقلاب مشروطیت ایران میں ڈاکٹر مہدی ملک زادہ نے تحریر کیا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت ان کے والد نے کی ہے۔ لیکن سید صاحب کے بیٹے سید محمد علی جمال زادہ نے "مردانِ خود ساختہ" میں اپنے والد (سید جمال الدین واعظ) کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے والد بچپن میں فوت ہو گئے اور ان کی پیدائش سنہ ۱۸۶۱ء (مطابق سنہ ۱۲۷۹ھ) لکھی ہے۔ لہٰذا اسی تاریخ کو تاریخ کو حالات زندگی کے لئے بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

تعلیم

تعلیم کا شوق انہیں دوبارہ مدرسہ میں لے آیا اور ۱۸۸۱ء تک طہران میں تعلیم پاتے رہے۔ چونکہ اصفہان میں ان کے چچازاد[۱] بھائی موجود تھے۔ اس لئے اپنی والدہ کے ساتھ ۱۸۸۲ء میں ان کے بلانے پر اصفہان چلے گئے اور یہاں مدرسہ میں داخل ہو کر اپنی تعلیم جاری رکھی۔ انہوں نے مروّجہ علوم حاصل کئے اور علم کلام اور تفسیر میں مہارت حاصل کی۔

دورانِ تعلیم میں (مئی ۱۸۸۶ء) ہی ملک المتکلمین کی تقریریں سنیں اور ان سے بہت متاثر ہوئے۔ آہستہ آہستہ روضہ خوانی کا شوق پیدا ہوا۔ اپنی سادہ بیانی اور شیریں زبانی کے سبب عوام میں مقبولیت حاصل کرلی۔ حالات سازگار ہوتے چلے گئے اور یہیں سراج الملک کے خاندان میں شادی کرلی۔

شادی کے بعد اصفہان میں مستقل طور سے سکونت اختیار کرلی۔ اور وعظ وخطابت کو پیشہ کے طور پر اختیار کرلیا۔ اسی وجہ سے "واعظ" مشہور ہوئے۔

انہیں اصفہان میں حاجی میرزا نصر اللہ ملک المتکلمین کے علاوہ، شیخ مجد الاسلام، عبدالوہاب امامی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ شروع سے خود ان کے گھر کے حالات نے ان کو بے باک اور آزاد کر دیا تھا اس لئے

۱؎ یہ صاحب علامہ اسمٰعیل مدرس اصفہانی مجتہد علم ریاضت والہیات کے بیٹے تھے اور اصفہان میں رہتے تھے۔

ملک المتکلمین کی تقریریں ان کی آزادانہ طبیعت پر بہت اثر انداز ہوئیں
اس زمانہ میں مسعود میرزا ظل السلطان اصفہان کا گورنر تھا۔ اُس کی
مخالفت کی وجہ سے ملک المتکلمین کو تقریریں کرنے کا موقع نہ مل سکا اور
انہیں ترکِ وطن کرنا پڑا۔

سید جمال الدین واعظ نے آہستہ آہستہ ملک کی خراب حالت پر تبصرہ
کرنا شروع کیا اس لئے وہ بھی حکومت کے زیرِ عتاب آگئے اور مجبور ہو کر
اصفہان سے باہر چلے گئے۔

وہ ۱۹۰۰ء میں پہلی مرتبہ شیراز گئے جہاں انہوں نے اپنی تقریروں
میں لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ملک میں کارخانے جاری کریں تاکہ ملک
کی معاشی حالت درست ہو۔ اسی دوران میں ان کے پاس حاجی محمد حسین
کازرونی آئے جنہوں نے ایک کمپنی "شرکت اسلامی" کے نام سے بنائی تھی
اُن کی تقریر کا حوالہ دے کر اپنی کمپنی کا ذکر کیا۔ سید جمال الدین واعظ بہت
متاثر ہوئے اور اسی زمانے میں ایک کتاب بھی لکھی۔ جس میں انہوں نے اپنے
وطن کو ملکی صنعت کو فروغ دینے کی طرف متوجہ کیا۔

۱۹۰۱ء میں سید جمال الدین واعظ اصفہان سے تبریز گئے اور وہاں
پر ان کو آزادی خواہوں سے ملنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ ان تقریروں
نے اُن لوگوں میں اور بھی جان ڈال دی۔ سید صاحب نے وہاں عدل اور
قانون کی اہمیت پر مسلسل تقریریں کیں۔ ان کے بیانات کو اس قدر پسند
کیا گیا کہ وہ دوبارہ ۱۹۰۳ء میں محرم کے مہینے میں بلائے گئے اور ان کی

محققانہ تقریروں کی بنا پر ان کو "صدر المحققین" کا لقب دیا گیا۔ اس دوران میں ان کی توجہ تصنیف اور تالیف کی طرف ہوئی اور "رویائے صادقانہ" کے نام سے ایک اور کتاب تصنیف کی لیکن اس تصنیف کی وجہ سے حکومت وقت ان کی مخالف ہو گئی۔

اس کتاب میں انہوں نے حکومت کے خلاف اصفہان کے علمائے ریاکار کے واقعات تحریر کر کے ان پر سخت تنقید کی اور اسی نسخے چھپوا کر خاص خاص آدمیوں کے پاس خفیہ طور پر بھیجے۔ اس لئے ان کی آزاد خیالی کی وجہ سے لوگوں نے انہیں "بابی" کہنا شروع کیا اور ظل السلطان حاکم اصفہان اس قدر ناراض ہوا کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ موقع ملنے پر وہ سید صاحب کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں جلا دے گا۔ اس وقت سید صاحب موصوف تبریز سے واپس آ کر طہران میں قیام پذیر تھے۔

جب یہ خبر اُن کے گھر پہنچی تو گھر والوں نے فوراً ایک خاص پیغامبر کے ذریعے سید صاحب کو کہلا بھیجا کہ "اُن کا اصفہان آنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔"

طہران کی مستقل سکونت سنہ ۱۹۰۳ء میں

سید جمال الدین واعظ نے طہران میں مستقل سکونت اختیار کی اور اپنے اہل و عیال کو بھی طہران بلا لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ مسجد شاہ میں واعظ مقرر ہو گئے۔

سید صاحب شیریں بیان ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کی نفسیات

سے خوب واقف تھے۔ عوام ان کی سادہ لیکن دلنشیں تقریروں کے لئے بے چین رہا کرتے تھے اور کوئی ایسی مجلس نہیں ہوتی تھی کہ جس میں سید صاحب کی تقریر نہ ہوتی ہو۔

ایک اور صفت جو خاندانی لحاظ سے اُنہیں ورثے میں ملی تھی، اُن کی بے باکی اور حق گوئی تھی، ان کے چچا علامہ اسمٰعیل صدر اصفہانی نجف اشرف میں مشہور مجتہد تھے اور اپنی غیر معمولی شخصیت کے علاوہ جرأت اور دبیا کی میں مشہور تھے اس لئے قاچاری پادشاہ بھی اُن سے ڈرتے تھے اور علمیت کی بناء پر ان کا احترام کرتے تھے۔

سید جمال الدین عوام النّاس کی تکلیفوں سے سخت متاثر تھے اور ان کے حالات کو اپنی تقریروں میں بیان کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی تقریریں تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔

"احمد کسروی" نے تاریخ مشروطۂ ایران میں لکھا ہے کہ "وہ بادشاہ کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرتے تھے۔ "آزادی اور قانون" دو اُن کے مشہور موضوع تھے جن پر وہ تقریر کرتے تھے اور فصیح البیان ہونے کی وجہ سے تقریر کا حق ادا کرتے تھے"۔

لطیفہ ایک دفعہ انہوں نے آزادی اور قانون کا مفہوم ایک عجیب طریقے سے سمجھایا۔ انہوں نے دورانِ تقریر میں دریافت کیا۔ "ہم سب سے زیادہ کس چیز کے محتاج ہیں؟" سامعین میں سے لوگوں نے مختلف جوابات دیئے۔ اس پر انہوں نے فرمایا۔ "نہیں۔ ہم سب سے پہلے

"قانون" کے محتاج ہیں، اچھا اس کے ہجے کرو۔" یہ کہہ کر انہوں نے فرمایا۔ "قاف۔ الف۔ نون۔ واؤ۔ نون۔" حاضرین میں سے ہزاروں آدمیوں نے لفظ "قانون" کے ہجے کرنے شروع کئے اور اس کے بعد عرصۂ دراز تک لوگ اس لفظ کے ہجے کرتے ہوئے پائے گئے۔

گویا اس طرح "قانون" کا لفظ ذہن نشین کر کے استبدادیت کے خلاف غیر محسوس طریقے پر سوچنے کا موقع پیدا کیا۔

(۲) ایک اور دوسری تقریر میں دریافت کیا۔ "کیا تم سرخ کپڑوں سے ڈرتے ہو؟" جواب دیا گیا "نہیں۔" "کیا تم انار کی سبز ٹہنی سے ڈرتے ہو"؟ جواب دیا گیا۔ "نہیں" "کیا تم نشانِ شیر و خورشید سے ڈرتے ہو؟" جواب دیا گیا "نہیں"۔ "بہت اچھا۔" "اب تم اس مونچھ کو ایک کمزور آدمی کے لب پر چپکا دو اور اس کی ٹوپی پر نشانِ شیر و خورشید لگا دو، ایک پارچہ سرخ اس کے گلے میں ڈال دو اور انار کی سبز ٹہنی اسکے ہاتھ میں دو۔ اس وقت کیا بنے گا۔؟" جواب ملا "فراش" "پس تم کس لئے فراش سے ڈرتے ہو؟" یہ واقعہ مظفرالدین شاہ کے زمانہ کا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر انہوں نے تقریر کے دوران میں سامعین سے دریافت فرمایا۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ انسان، خیمہ کے کھونٹے کی بجائے استعمال میں لایا گیا ہے؟" لوگوں نے کہا: "نہیں"۔ آپ نے فرمایا: "سنو! ایک دفعہ بادشاہ شکار کے لئے گیا۔ سردی شدید اور متواتر تھی۔ سخت برفباری ہو رہی تھی۔ بادشاہ خیمہ میں مقیم تھا۔ برفباری اور ہوا

کی شدت سے اس امر کا اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کھونٹے اکھڑ جائیں اور خیمہ گر پڑے۔ چنانچہ چند سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ باہر جائیں اور خیمے کی طنابوں کو ہاتھوں سے پکڑے رہیں تاکہ شدتِ ہوا سے خیمہ گرنے نہ پائے۔

صبح کو دیکھا گیا کہ وہ سپاہی جو خیمے کی طنابوں کو پکڑنے پر مقرر کئے گئے تھے، شدتِ برفباری کی وجہ سے خشک ہو کر رہ گئے اور ان کے بدن برف سے منجمد ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا "یہ ہے مقدس ترین قربانی اعلیٰحضرت کے وجود کے لئے" اور یہ ہے وہ مثال جس میں انسان خیمہ کے کھونٹے کی بجائے استعمال میں لایا گیا ہے۔

پروفیسر براؤن نے "تاریخ انقلاب ایران" میں لکھا ہے کہ "سیّد جمال الدین واعظ متوسط اور نچلے طبقہ میں بے اندازہ مقبولیت رکھتے تھے اس لئے کہ ان کی زبان اس قدر عام اور سادہ تھی کہ کسی کو سمجھنے میں کوئی دقّت نہیں ہوتی تھی۔

بقول میرزا عبداللہ مستوفی مؤلف "شرح زندگانیٔ من یا تاریخ اجتماعی واداری دورۂ قاچاریہ" (جلد دوم صفحہ ۹۰)

"ان کی تقریروں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے میں وہ تقریریں روزنامہ "الجمال" میں شائع ہو کر فروخت ہوتی تھیں۔

مظفّر الدین شاہ کی کمزور طبیعت سے فائدہ اٹھا کر حکامِ وقت رعایا پر طرح طرح کے مظالم روا رکھتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۱۹۰۵ء میں پیش آیا۔

اور اس کے سلسلہ میں ایک زبردست احتجاجی جلسہ مسجد شاہ میں منعقد ہوا۔ جس میں امام جمعہ کے علاوہ علامہ بہبہانی، علامہ طباطبائیؒ، صدر العلماء، مختلف پیشوں کے نمائندے حضرات کثیر تعداد میں تھے۔ چونکہ سب لوگوں کو حالات سے آگاہی حاصل نہ تھی۔ اس لئے طے پایا کہ سید جمال الدین واعظ ان کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کریں۔ سید موصوف ایک آتش بیان اور پُرجوش مقرر تھے اور اپنی آزادخیالی کے باعث بہت مشہور تھے۔ وہ تو وقت کے منتظر تھے کہ ظالموں کے ظلم اظہر من الشمس کرنے کے لئے ان کو ایسا موقعہ ہاتھ آیا۔ انہوں نے خطرات کو پیش نظر نہ رکھا اور فوراً ممبر پر پہنچ گئے۔ لوگوں نے دوکانیں بند کر دی تھیں اور جوق در جوق مسجد شاہ میں جمع ہو رہے تھے۔ صحنِ مسجد سامعین سے پُر تھا۔ سیّد جمال الدین واعظ نے "عدل" کی تعریف بیان کرنی شروع کی اور بادشاہ کی ذمہ داریوں کا ذکر کیا۔

اس کے علاوہ علاء الدولہ کے ظلم کا ذکر بہت سخت الفاظ میں کیا۔

اس کے بعد یہ تاریخی فقرہ انہوں نے کہا۔ "اگر بادشاہ عالی مرتبت مسلمان ہے تو علماء کے ساتھ تعاون کرے گا اور ان کی بے غرضانہ گفتگو کی طرف توجہ دے گا۔ اگر قوم کے مفاد کے خلاف کام کرے گا تو قوم اس کو...... ...... ابھی یہ جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ امام جمعہ نے منبر کے نیچے بیٹھے چیخ مار کر کہا "اے سیّد! بے دین! اے کافر! اے بابی! اسلام کے بادشاہ کی توہین کرتا ہے۔"

اس اچانک شور سے سب لوگ چند لمحوں کے لئے مبہوت ہو گئے اور سید بیچارے کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ کہنے لگے کہ "میں نے تو حرف شرط کے ساتھ کہا ہے۔ خود خدا نے بھی پیغمبر کو ان ہی الفاظ میں خطاب کیا ہے۔ اور حرف شرط کے ساتھ جملہ مشروط ہوتا ہے"......

امام جمعہ نے فراشوں اور نوکروں کو حکم دیا کہ سیّد کو منبر سے اتار لیا جائے۔ سینکڑوں فراش دوڑ پڑے اور منبر پر حملہ کر دیا۔ اسی اثنار میں مسجد کے دروازوں کو بند کر دیا گیا اور لوگوں کی چیخ و پکار نے مسجد شاہ کو سر پر اٹھا لیا۔

سید بیچارے حیران و پریشان ایک گوشہ میں کھڑے تھے۔ وہ لوگوں کے بیچ میں پھنس گئے تھے۔ اتفاقاً دو طاقتور بازوؤں نے سید ضعیف کو اُٹھا لیا اور علاّمہ طباطبائیؒ کے گھر پہنچا دیا (یہ دونوں علامہ طباطبائیؒ کے صاحبزادے میرزا محمد صادق طباطبائیؒ اور میرزا عبد المہدی تھے)

اُسی رات کو عین الدولہ نے سیّد جمال الدین واعظ کی گرفتاری کا حکم دیدیا لیکن موصوف رُوپوش ہو گئے۔ انہوں نے پہلے رات علامہ طباطبائیؒ کے گھر میں چند راتیں اپنے بہنوئی کے گھر اور تین راتیں حاجی میرزا یحییٰ دولت آبادی کے گھر میں گذاریں۔ اس کے بعد ایک رات اصفہانی تاجر کے ہاں۔ چند راتیں ناظم اسلام کرمانی مؤلف "تاریخ بیداری" کے گھر میں گذاریں۔

ان تمام تکلیفوں میں سید عبد الوہاب معین العلمار اصفہانی ان کے ساتھ رہے اور وہ اُن کی رہنمائی میں ایک مکان سے دوسرے مکان میں جاتے رہے اس طرح تقریباً ایک سال چھپے رہے۔ آخر کار انہی کے مشورے کی بنار پر شاہ

عبد العظیم چلے گئے اور ان لوگوں سے مل گئے جو وہاں بست کے سلسلہ میں مقیم تھے

بست شاہ عبد العظیم

لوگ ان کے اس طرح آنے پر از حد خوش ہوئے لیکن عین الدولہ اور درباریوں کی سختی کی وجہ سے انہوں نے کوئی تقریر نہیں کی۔ سید صاحب کی شعلہ بیانیوں کے سبب خود حاجی شیخ محمد واعظ اور شیخ مہدی سلطان نے انتہائی مخالفت کی، چنانچہ وہ خاموش رہے سید جمال الدین چند روز شاہ عبد العظیم میں ٹھہرے اور پھر اپنے گھر واپس آگئے

جب علما شاہ عبد العظیم سے واپس آئے تو یہ بھی استقبال کے لئے گھر سے نکلے۔ لوگوں نے ان کو دیکھا اور ان کے ہاتھوں کا بوسہ لینے کے لئے ان کی طرف دوڑ پڑے اور جھوم جھوم کر یہ کہنے لگے۔

ع سید و سرور آمدہ ۔ صاحب منبر آمدہ

لیکن عین الدولہ کا غصہ کم نہ ہوا تھا اور وہ ان کا ذکر اکثر غصہ کے عالم میں کرتا تھا۔

جنوری ۱۹۰۶ء میں نیر الدولہ حاکم طہران نے شیخ مرتضیٰ کو خط لکھا کہ بہتر ہے کہ سید جمال الدین واعظ مشہد مقدس کی زیارت کو چلے جائیں۔ میں ان کے سفر خرچ کا ذمہ دار ہوں۔ ظاہر تھا کہ یہ عین الدولہ کا ہی اشارہ تھا۔ طلبا نے اس حکم پر احتجاج کیا۔ علامہ بہبہانی نے سفارش کے لئے شیخ مہدی واعظ کو اس کے پاس بھیجا لیکن وہ نہ مانا۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ اگر اب وہ مشہد چلے جائیں تو میں عشرہ محرم کے بعد ان کو واپس بلا لوں گا۔ اس لئے کہ اگر انہوں نے محرم کی مجالس میں تقریریں کیں تو فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا۔ اس کے بعد

قسم کھا کر کہا کہ اگر وہ نہ گئے تو میں ان کو قتل کروا دوں گا۔ اگر وہ چلے گئے تو پھر میں وعدہ کرتا ہوں کہ محرم کے بعد آنے کی اجازت دے دوں گا۔ بادشاہ کی طرف سے ایک ہزار تومان سفر خرچ کے لئے دیئے گئے۔ سفر خرچ کے متعلق مؤلف تاریخ مشروطیت ایران کا بیان اس سے مختلف ہے (جلد دوم صفحہ ۹۴) "سید جمال الدین واعظ کو یہ رقم (ایک ہزار تومان) شیخ مہدی نے چند لوگوں کے سامنے دی۔ حاضرین میں آقائے سید حسین بروجردی، آقائے میرزا محسن، شیخ محمد مہدی بروجردی قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن سید جمال الدین واعظ نے یہ رقم لینے سے انکار کیا اور بادشاہ کو یہ لکھ کر بھیج دیا۔ "فدوی اگرچہ نہایت ممنون ہے کہ الطافِ شاہانہ سے نوازا گیا ہے۔ لیکن اس سفر کا مقصد سوائے تعمیلِ حکم کے کچھ نہیں ہے اس لئے اس رقم کو قبول کرنے سے معذرت خواہ ہوں۔"

(حررہ الاحقر سید جمال الدین الواعظ الموسوی)

انہوں نے ستر تومان شیخ حسن دلال سے قرض لئے اور ایک گاڑی میں قم روانہ ہو گئے۔"

مؤلف "تاریخ بیداریٔ ایران" کا بیان ہے کہ "آقا سید جمال الدین واعظ نے علامہ بہبہانی سے کہا" ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ بادشاہ پارلیمنٹ کی منظوری دیدے۔ مجھے اگر یہ علم ہو جائے کہ پارلیمنٹ کے افتتاح کی منظوری میرے قتل پر موقوف ہے تو میں اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہوں۔ آقای بہبہانی نے فرمایا کہ "یہ بات ابھی قبل از وقت ہے اس کا ذکر نہ کرو۔ ابھی تو فقط عدالتوں کے قیام کا مطالبہ ہی کافی ہے۔"

آخر کار ۲۶ ذی الحجہ بروز پیر سیّد جمال الدین واعظ اپنے بیٹے اور ایک ملازم کے ساتھ طہران سے چلے گئے اور قم پہنچ کر گوشہ نشین ہو گئے اور عوام سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔"

سیّد جمال الدین واعظ کا محرم کے مہینے میں طہران سے چلا جانا لوگوں پر بہت شاق گذرا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک شب نامہ (اعلان) شائع ہوا جس میں سیّد صاحب موصوف کے اس طرح چلے جانے پر سخت تنقید کی گئی تھی۔

مہاجرتِ کبریٰ

۱۲ جنوری ۱۹۰۶ء میں علماء نے قم کو ہجرت کی۔ سید صاحب نے بھی ہجرت کی۔ بادشاہ اور قوم پرستوں کی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے حکومتِ مشروطہ کے قیام کی منظوری دیدی۔ چنانچہ ۷ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو پارلیمنٹ کا افتتاح ہوا۔ ۷ جنوری ۱۹۰۷ء کو مظفر الدین شاہ فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا محمد علی شاہ تخت نشین ہوا۔

دورِ حکومت محمد علی شاہ

محمد علی شاہ شروع ہی سے پارلیمنٹ کا مخالف تھا اور خصوصیت سے ان لوگوں کے خلاف تھا جو آزادی کا مطالبہ پیش کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ باوجود اس بات کے کہ وہ تبریز میں ولیعہدی کے زمانہ میں سید جمال الدین واعظ کی تقریروں سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن آزادی خواہی کی بنا پر وہ اِن سے بھی ناراض ہو گیا۔ وزیرِ اعظم اتابک اعظم نے ان کو ہموار کرنے کے لئے بلایا اور سواری کے لئے گاڑی بھی بھیجی، یہ جانا نہیں چاہتے تھے اور انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جبراً و قہراً گئے۔ واپسی پر شاہ عبد العظیم میں بست کا ارادہ کر لیا۔ راستے میں

گاڑی الٹ گئی اور سید صاحب گاڑی کے نیچے آگئے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر شاہ عبدالعظیم، پہنچے اور بست نشین ہو گئے۔ اس حادثہ کے سبب اُن کا پاؤں آخر وقت تک لنگ رہا۔ اور وہ دقت سے چل سکتے تھے۔

اسی زمانۂ علالت میں ان کو اتابک اعظم کے قتل کی خبر ملی۔ وہ خوش بھی ہوئے اور متاسف بھی، کہنے لگے "کس نے اس کو تنہا قتل کیا ہے۔"؛ جملہ بہت معنی خیز تھا۔

چہلم عباس آقا

۱۹۰۶ء کو عباس آقا کا چہلم تھا لیکن یہ بڑی مشکل سے قبرستان پہنچے۔ دو شاخہ سے سہارا لے کر منبر پر گئے اور ایک معرکۃ الآرا تقریر کی۔ لوگوں میں جس قدر وہ بحیثیت واعظ مشہور تھے اُسی قدر ملاؤں نے ان کو بابی اور بے دین کہہ کر بدنام بھی کر رکھا تھا۔ ان کے متعلق کہہ دیا گیا تھا کہ ان کے عقائد پختہ نہیں ہیں اور وہ کبھی کبھی ان چیزوں کے متعلق خلوت میں بھی اشارہ کر دیتے تھے۔

بہر حال سید جمال الدین واعظ کی تقریریں انجمن ملی اور مسجد سپہ سالار میں مشروطیت اور آزادی کے متعلق ہر موقع پر ہوتیں۔ کوئی ایسی قابل ذکر مجلس نہ تھی جہاں ملک المتکلمین تقریر کریں اور ان کی تقریر کے بعد سید جمال الدین واعظ تقریر نہ کریں۔ یہاں تک کہ آزادی خواہوں نے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے طہران میں جو انقلابی کمیٹی بنائی تھی، اس کے بھی وہ رکن تھے۔

پروفیسر براؤن نے تاریخ انقلاب ایران میں لکھا ہے کہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۰۷ء کو بادشاہ نے منجملہ اور آدمیوں کے سید جمال الدین واعظ کو بھی طہران سے باہر

چلے جانے کے متعلق پارلیمنٹ سے مطالبہ کیا تھا کہ اگر یہ مان لیں تو حکومت ان کا تمام خرچ برداشت کرے گی۔

یہاں تک کہ اسی مطالبے کے پیش نظر اس نے ۲۱ر جون ۱۹۰۸ء کو جن آدمیوں کو نکال دینے کا مطالبہ کیا تھا ان میں سید جمال الدین واعظ بھی شامل تھے۔ بقیہ حضرات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مرزا جہانگیر خان (۲) سید محمد رضا مساوات (۳) ملک المتکلمین (۴) مرزا داؤد خان (۵) ظہیر السلطان (۶) میرزا یحییٰ (۷) مرزا علی محمد بیدار۔ اسی دار و گیر میں ایک جلسہ حاجی محمد حسین تاجر کے مکان پر ہوا جس میں خاص طور پر یہ حضرات شامل تھے (۱) ملک المتکلمین (۲) مرزا جہانگیر خان (۳) سید محمد رضا مساوات (۴) حاجی مرزا علی محمد (۵) قاضی قزدینی (۶) میرزا یحییٰ۔

اس جلسہ میں یہ طے پایا کہ "اب حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں اس لئے اب نیک نامی سے مرنا بدنامی کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے۔"

پارلیمنٹ کے انہدام سے قبل یہ ایک آخری مجلس تھی اور اس کے بعد کے حالات نے ان لوگوں کو ملنے کا موقع ہی نہیں دیا

گرفتاری ۲۳ر جون ۱۹۰۸ء کو پارلیمنٹ کی عمارت منہدم کر دی گئی اور شمع آزادی کے سب پروانے گرفتار کر لئے گئے۔

تباہی کے بعد پارلیمنٹ کی تباہی کے بعد جب ملک المتکلمین کے ساتھ سید جمال الدین واعظ بھی امین الدولہ پارک میں پہنچے اور وہاں سے نکلنے کے بعد سب متفرق ہو گئے، تو سید صاحب چونکہ دوڑ نہیں

سکتے تھے اس لئے وہ دیوار کے سہارے کھڑے منتظر تھے کہ کہاں جائیں، کہ ایک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر آئی۔ سید صاحب کو دیکھا اور ان کو پہچان کر اندر لے گئی۔ وہ گھر اعتماد الدولہ کا تھا اور وہ عورت اعتماد الدولہ کی بیوی تھی۔ اس رات وہاں مہمان رہے۔ اگلے دن لباس بدل کر مرزا اسد اللہ خان کے ساتھ عتبات عالیات کے ارادے سے قم و ہمدان کے راستہ سے روانہ ہو گئے۔

اس زمانے میں ہمدان میں ان کا ایک خاص دوست مظفر الملک حاکم تھا ان کا خیال تھا کہ وہ بآسانی سرحد عبور کر کے اپنے چچا علامہ اسمٰعیل صدر اصفہانی کے پاس نجف اشرف پہنچ جائیں گے۔

ہمدان پہنچے اور محلہ دباغ خانہ میں مقیم تھے کہ مظفر الملک کا نائب باشی آیا اور گرفتار کر کے لے گیا اور دار الطویلہ میں پانچ دن رکھا۔ ایک رات مظفر الملک کا بھائی آیا اور ان کو مظفر الملک کے گھر لے گیا۔ وہ وہاں کئی دن تک رہے۔ ظاہری طور پر اس نے مہربانی کا سلوک کیا۔ اسی دوران میں محمد علی شاہ کو اطلاع دی گئی اور محمد علی شاہ نے حکم دیا کہ سید صاحب کو امیر افخم حاکم بروجرد کے سپرد کر دیا جائے۔ اس لئے وہ سید صاحب کو ہمدان سے شورین لے گیا اور وہاں سعید خاں منیر الدولہ آغا باشی کے مکان میں رہے۔

یہ حالت گویا ان کی نظر بندی کی تھی۔ رات کو سپاہی کا پہرہ لگا دیا گیا۔ وہ کچھ دنوں وہاں رہے۔ آخر کار ان کو ایک خچر پر بٹھا کر پاؤں باندھ دیئے گئے اور بروجرد جا کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور چند روز کے بعد ان کو قتل کر دیا گیا

البتہ مشہور ہے کہ پہلے اُن کو قہوہ پلایا گیا اُس کے بعد تسمہ سے اُن کا گلا گھونٹ دیا گیا۔[1]

بقول سید جمال زادہ بعض لوگ ان کے انتقال کی تاریخ ۲۶ رجب ۱۳۲۶ھ (۲۵ اگست ۱۹۰۸ء) بھی بتاتے ہیں۔ لیکن یہ تاریخ محقق نہیں ہے۔ اس لئے کہ قبر پر ماہ شوال ۱۳۲۶ھ (نومبر ۱۹۰۸ء) ہے۔ ان کے بیٹے سید محمد علی جمال زادہ اس زمانہ میں بیروت تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سید صاحب نے بروجرد کے قید خانہ سے اپنے بیٹے کو خط لکھا اور ایک شخص کے ہاتھ بھیجا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ "اس خط کا لانے والا وہ نوجوان ہے جو قید خانہ میں میرا مونس و ہمدم رہا۔ اس نے مجھ پر بہت مہربانی کی ہے اور وہ نشانی کے طور پر میری انگوٹھی بھی لا رہا ہے۔ مناسب ہے کہ اس کو اس کا اجر اچھی طرح دیا جائے اور جس راستہ پر میں چل رہا ہوں اُسی راستے پر تم چلنا۔ اپنی تعلیم مکمل کر کے بیروت سے واپس آنا اور کتاب تلماک[2] ضرور پڑھنا۔ اس سے پہلے کہ تم کتاب ختم کر دگے

---

[1] بقول صاحب تاریخ انقلاب مشروطیت "مظفر الملک نے بادشاہ کو لکھا تھا کہ مجھے سید جمال الدین واعظ کے قتل سے باز رکھا جائے اور یہ ہولناک کام کسی ایسے شخص کے سپرد کیا جائے جو ان کا دوست نہ ہو۔ اگرچہ یہ عذر اس کو قاتل ہونے کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اس نے دوستی کے پردہ میں اپنی بے غیرتی اور بے وفائی کا ثبوت دیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ کیوں ہمدان سے بروجرد بھیجے گئے۔"

اگرچہ صاحب تاریخ زندگانی یحییٰ نے مظفر الملک کو بچانے کی کوشش بھی کی ہے کہ ہمدان کے بعض دوسرے جاسوسوں نے یہ اطلاع بادشاہ تک پہنچا دی تھی کہ ان کا قیام مظفر الملک کے یہاں ہے"

(تاریخ انقلاب مشروطیت جلد چہارم صفحہ ۱۵۶)

[2] یہ کتاب لوئی چہاردہم کے زمانہ میں لکھی گئی تھی جس میں بادشاہوں کے لئے اصول سلطنت بتائے گئے تھے اس کا ایک حصہ ایران میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ باقی حصے حکومت ایران نے ضبط کر لئے۔

میری زندگی ختم ہو جائے گی۔"

مقبرہ اُن کی قبر بروجرد کے مغربی حصّے میں ہے۔ ایک پاک دل آزادی خواہ میرزا ہمایوں خان سیاح پیشکار مالیۂ بروجرد نے ان کی قبر پختہ بنوادی ہے۔ اب ان کی قبر ایک وسیع احاطے میں ہے جہاں وسیع باغ بھی لگادیا گیا ہے۔ بروجرد میں ان کے نام پر ایک مدرسہ "جمالیہ" بھی جاری ہے اور طہران میں ایک سڑک کا نام ان کے نام پر رکھا گیا ہے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ تھے وہ واقعات، جن کے دوران میں "شہدائے راہِ آزادی" پیدا ہوئے۔ بڑے ہوئے، تربیت پائی، کارنامے انجام دیئے اور ملک و ملّت پر نثار ہو گئے۔

حقیقت میں دنیا میں یہی لوگ ہیں جن کی زندگیوں کے حالات کا مطالعہ نفع بخش ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا شمار اپنے پختہ عزائم، بلند مقاصد اور عظیم الشان کارناموں کی بنا پر دنیا کے عظیم ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے غیر معمولی کردار سے نوعِ بشر کی اجتماعی زندگی کو متاثر کیا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی زندگیوں کے کارناموں کا مطالعہ قوموں کی اخلاقی اور اجتماعی حالت کو درست کرنے کے لئے لازمی ہے۔

ایسے ہی غیر معمولی لوگوں کی زندگیوں کے کارناموں کا مطالعہ لوگوں کو اس امر کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ اُن سے متاثر ہو کر اس دنیا میں نوعِ انسانی کے

لئے مفید کام انجام دیں۔ اور اپنے مال اور اپنی جان کی قربانیوں سے اپنے ملک اور اپنی ملّت کے لئے عظمت اور سربلندی کا سرمایہ بہم پہنچائیں۔ حقیقت میں ایسے ہی لوگوں کی زندگی ہمارے لئے حصولِ عظمت کا نمونہ ہے

باب ہشتم

شہیدوں کا خون رنگ لایا[1]

تبریز میں علمِ آزادی

سب سے پہلے یہ خبر تبریز پہنچی۔ اہلِ تبریز محمد علی شاہ سے واقف تھے۔ لہذا وہاں آزادی کا جذبہ لوگوں میں زیادہ تھا اور تیاری جاری تھی۔ اس خبر کے پہنچتے ہی مقابلہ کی ٹھن گئی (اور خود محمد علی شاہ بھی فکر مند تھا کہ تبریز سے ہی مصیبت میرے سر پر آئے گی لہذا وہاں کسی سخت حاکم کو بھیجا جائے)

آزادی خواہوں اور بادشاہ کے موافقین میں ٹھن گئی اور پارلیمنٹ کے مخالف

---

[1] قومی فوج کی شکست کے اسباب حسب ذیل ثابت ہوئے۔ اول۔ مجلس شوریٰ جو حکومت مشروطہ پارلیمنٹری حکومت کی ذمہ دار اور محافظ تھی، وہ خود تماشہ بین بن گئی اور اس نے موقع پر قوم کو پائیداری اور شجاعت کی طرف متوجہ نہیں کیا، بلکہ قوم کو بار بار منتشر کر دیا اور خود اپنے دشمن کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ پوری تیاری کرلے اور یہ ہمیشہ نرم باتیں کر کے مظلوم بنے رہے اور فضول باتوں اور مباحثوں میں وقت ضائع کر دیا۔

دوم:۔ خود اکثر ممبران پارلیمنٹ جو حقیقت میں بادشاہ کے طرفدار تھے انہوں نے بادشاہ کا رعب اور خوف دلوں پر غالب کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جو اسلحہ بڑی مشکل سے جمع کیا گیا تھا اُس کو

علماء نے اعلانِ جہاد کر دیا اور شہر میں دو محاذ قائم ہو گئے۔ آزادی کے علمبردار ستار خان تھے جنہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور روسی کونسل کی فہمائش کے باوجود وہ اپنی کوششوں اور لڑائی سے باز نہ آیا اور اس کی امداد کے لئے پچاس روسی، قفقازی آزادی خواہ بھی آملے اور آذربائیجان کا حاکم فجر الدولہ شروع شروع میں تو آزادی خواہوں کا طرفدار تھا لیکن جوں ہی مجلس کے انہدام کی خبر ملی تو وہ بھی خاموش ہو گیا۔ محمد علی نے فجر الدولہ کے بجائے عین الدولہ کو گورنر بنادیا۔ فجر الدولہ چپکے سے قفقاز کے راستے یورپ چلا گیا۔

محمد علی شاہ نے آذربائیجان ایک لشکر جرار بڑے اہتمام و انتظام سے بھیجا۔ تہران کے بعد یہ دوسرا اہم مقام تھا جس کے سر کرنے کے لئے بڑی تیاری اور عجلت کی ضرورت تھی۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو چار سو ایرانی کاسک بریگیڈ معہ چار توپوں کے بسرکردگی افسران روس طہران سے تبریز روانہ ہوئی کہ دستوری حکومت کے مویدین کا قلع

ترکیب کے ساتھ علیحدہ کر دیا۔ اور لڑائی کے دن بہت سے مجاہدین کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔

سوم :۔ قومی سرداروں کی کوئی امداد نہیں کی گئی اور ان کو بھلا دیا گیا۔

چہارم :۔ میرزا سلیمان میکدہ کے قید ہو جانے کے سبب انجمن برادران دروازہ قزدین جس میں کئی سو مسلح افراد تھے وہ سب متفرق ہو گئے۔

پنجم :۔ خلج کے سپاہی جو مدد کے لئے آئے تھے اور حضرت عبد العظیم میں مقیم تھے جب یہ خبر سنی تو ڈر کے مارے نہ آئے۔

ششم :۔ امیر حشمت (سردار مجاہدین) جو مجاہدین کی ایک جماعت کا سردار تھا اور جنگ کا منتظر تھا

جمع کر دیں۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۰۸ء تک دستوری حکومت والے سارے شہر پر قابض تھے۔ نومبر کے آخر تک باوجود قزاقوں کی فوج اور توپوں کے جو شہر کے محاصرین کی امداد کے لئے آئی تھی، تبریز کی دستوری حکومت والے ان پر فتحیاب ہوتے رہے۔ اس سے اور اتنا فائدہ ہوا کہ دوسرے شہروں کے دستوری حکومت والے اپنی تجاویز کو پورا کر سکے اور چار مہینے کے عرصہ میں وہ رشت، اصفہان، لار، شیراز، ہمدان، مشہد، استرآباد، بندر عباس اور بوشہر پر بخوبی حاوی ہو گئے۔

۵ جنوری ۱۹۰۹ء کو بختیاری قبائل کے دو سردار صمصام الدولہ اور ضرغام السلطنۃ معہ اپنے ہزار آدمیوں کے شہر اصفہان پر قابض ہو گئے اور بادشاہی فوج کو مار کر منتشر کر دیا۔ بختیاریوں نے دستوری حکومت کی حمایت کا بیڑا اٹھایا۔

لیکن اس روز معہ اپنے ساتھیوں کے چھپ گیا اور جنگ کے اختتام پر سفارت انگلشیہ میں پناہ لی۔

ھفتم:۔ خود حیدر خان عمو اغلی جس کے پاس قفقازی (سپاہی) تھے اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے آتشیں بموں سے دشمن کو ختم کر دے گا، اس روز بالکل نہیں دکھائی دیا۔

ھشتم:۔ طباطبائی اور بہبانی دونوں علماء جن کا اثر قوم پر بہت زیادہ تھا بجائے اس کے کہ قوم کو جنگ آزادی کی طرف متوجہ کرتے۔ قرآن ہاتھ میں لیکر لوگوں کو لڑائی سے باز رکھ رہے تھے۔

نہم:۔ خصوصاً علامہ بہبانی جن کی شجاعت مسلم تھی، انہوں نے محض دعا پر اکتفا کیا اور نماز وحشت پڑھنا شروع کر دی حالانکہ خود آنحضرت صلعم نے خود جنگ بھی کی اور دعا بھی کی۔ حضرت علی کے ہاتھ میں تلوار دی اور دعا کے لئے ہاتھ بھی بلند کئے۔

رشت کے شمال میں دستوری حکومت کی مدد کو وہ عجیب و غریب شخص سپہدار اعظم پشت پناہ بن گیا جو چند مہینے پہلے استر آباد کی شاہی فوج کا افسر تھا جو تبریز کا محاصرہ کر رہی تھی۔ جونہی اس نے گیلان میں انقلاب کی خبر سنی سرکاری فوج سے علیحدہ ہو کر مجذوبوں کی طرح گیلان کا رستہ لیا اور مجاہدین کے گروہ میں داخل ہو گیا۔

جنوری کا مہینہ اہل تبریز پر سخت گزرا۔ سینکڑوں بھوک سے مر گئے۔ گھاس تک کھانے کو میسر نہ تھی۔ رحیم خان کے وحشی قبائل اور شاہ کی فوجیں لوٹ کی امید میں شہر کا محاصرہ کئے پڑی تھیں۔ محصورین فدائیوں نے کئی دفعہ دھاوا کر کے شہر میں غلہ اور جنس لانے کی کوشش کی۔

مارچ میں رشت کے فدائیوں نے اس سڑک پر جو بحر کیسپین سے قزوین اور طہران کو جاتی تھی کچھ قبضہ کر لیا مگر وہ بختیاری فوجوں کے منتظر تھے جو اصفہان اور جنوب سے آ رہی تھیں۔

دہم:۔ تقی زادہ جو مجاہدین کی صف اول میں تھے اور انجمن آذربائیجان کے صدر تھے وہ جنگ کے دن موقع پر نہ پہنچ سکے۔ جن کی عدم موجودگی کے سبب خود علماء بھی متزلزل ہو گئے۔

یازدہم:۔ خود ملک المتکلمین نے لیاخف کو اسلحہ لینے سے روکا۔ ورنہ سرکاری فوجوں کی شکست یقینی تھی۔

دوازدہم:۔ خود انگریز بھی جو شروع میں پارلیمانی طرز حکومت کے موافقین میں سے تھے روسیوں کے ساتھ مل گئے۔ جس کی وجہ سے روس کو تمام کاروائی میں اہم حصہ لینے کا موقع مل گیا۔

سیزدہم:۔ خود صدر مجلس کا اب کام تھا کہ وہ تمام مجاہدین کو جمع کر کے خود ممبران پارلیمنٹ کو بھی شامل ہونے پر مجبور کرتا تاکہ مقابلہ کی پوری کوشش کی جاتی۔ مختلف مقامات پر جو مورچے تھے ان میں ہم ہونی (؟) ہوتی تاکہ ان کو برابر مدد پہنچتی رہتی لیکن ان میں سے ایک بات بھی نہ ہو سکی۔ خود صدر مجلس تماشا دیکھنے لگے

اس اثنا میں دستوری حکومت کی فوجیں دارالسلطنت کی طرف بڑھنا شروع ہوئیں جو فوج اصفہان سے آئی تھی اس کا افسر بختیاری سردار صمصام السلطنہ تھا۔ ۷ رمئی کو سردار اسعد بھی جو ابھی حال میں یورپ سے خلیج فارس کی طرف سے واپس آیا تھا، اس سے آملا۔ شاہ نے اس فوج کے مقابلہ کے لئے بعض شاہی سپاہی بھیجے۔ اس درمیان میں دستوری حکومت کی فوج جو رشت سے آئی تھی اس نے قزوین پر قبضہ کرلیا۔ یہ شہر طہران کے شمال میں ۹۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس فوج کا افسر سپہدار اعظم تھا اور ۵ رمئی کو دستوری حکومت نے قزوین کو فتح کرلیا۔

ایک طرف سے بختیاری فوجیں طہران کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ دوسری طرف تھوڑے عرصہ میں قزوین کی دستوری فوجیں دوسری فوج سے جاملیں اس عرصہ میں برطانیہ اور سفارتخانۂ روس نے کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھا کہ بختیاری سرداروں کو اپنے ارادے سے باز رکھیں مگر ایک نہ چلی۔

اور جب دوسرے موقع چھوڑ کر گئے آپ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔

چہاردہم:- جب سرکاری فوجوں نے شہر کے آمد ورفت کے راستے بند نہیں کئے تھے اور پارلیمنٹ کے طرفدار عمل کے بعد مقابلہ کے لئے اٹھے لیکن تنظیم نہ ہونے کے سبب مقابلہ نہ کرسکے۔

بہر حال تقریباً ستر آدمیوں نے سفارت انگریزی میں پناہ لی جن میں تقی زادہ، معاضد السلطنہ، دہخدا، بہاء الواعظین، سید حسن حبل المتین اور دولت آبادی قابلِ ذکر ہیں۔

محمد علی شاہ کو یہ امر بھی ناگوار گزرا اور انگریزوں کے سفارتخانہ کا محاصرہ کرلیا تھا لیکن حکومت برطانیہ کے سخت احتجاج کے بعد محمد علی شاہ نے مجبور ہو کر محاصرہ اٹھالیا۔ بعد میں کچھ لوگ مثلاً سید عبدالرحیم خلخالی، سعید الممالک ناصر الملک یورپ چلے گئے۔

۲۳ جون کو اس فوج کا ہراول قم تک پہنچ گیا جو طہران کے جنوب میں ۸۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ باوجود ان تمام دھمکیوں کے جو سفارت روس اور برطانیہ کی طرف سے ہوئیں، ان پر اثر نہیں ہوا اور اس نے صاف طور سے جواب دیا کہ ہم بادشاہ سے لڑنا نہیں چاہتے۔ ہمارا مقصد طہران پہنچ کر بادشاہ کو ان وعدہ خلافیوں کے متعلق دریافت کرنا ہے کہ جو بادشاہ نے بار بار وعدہ کرنے کے باوجود پورا نہیں کیا۔ تاکہ بادشاہ اب دوبارہ پارلیمنٹ کا افتتاح کریں (اور مشروطہ حکومت کو دوبارہ جاری کر دیں۔

سردار اسعد نے آگے بڑھ کر سپہدار کی فوجوں سے اپنے آپ کو دولت آباد میں ملحق کیا۔ اور امیر مفخم کے ساتھ جنگ ہوتی رہی۔ اس جنگ کا نام جنگ رداہ ہے۔ جس میں سرکاری فوجوں کی تعداد چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ دونوں طرف سے شدید جنگ ہوئی اور فتح و شکست کے فیصلہ کے بغیر طرفین

البتہ روسی آزادی خواہوں نے خود روس میں اور روس کے باہر ایران کے ساتھ ہمیشہ علی ہمدردی کا ثبوت دیا، خصوصاً لینن اور سٹالن نے ان کی امداد کی (جس کے متعلق آئندہ دوسرے موقع پر تفصیل سے ذکر کرینگے) انگریزوں نے اس ہنگامہ کے بعد خود محمد علی شاہ پر زور دیا کہ مجلس کا افتتاح دوبارہ ہونا چاہیئے۔ شروع شروع میں تو محمد علی شاہ وعدہ کرتا رہا اور لوگوں کو طفل تسلیاں دیتا رہا۔ لیکن اس کے بعد اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ اس قسم کی پارلیمنٹ کا اجراء میں نہیں کروں گا۔ انگریز اب سمجھ چکے تھے کہ محمد علی شاہ روسیوں کے ہاتھ میں بک چکا ہے اس لئے اب روس کا اثر زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ لہذا خود انگریزوں کی ہمدردیاں عملاً اس کے ساتھ باقی نہ رہیں۔ مزید برآں یہ کہ علمائے نجف نے شدید احتجاج کئے جس کے نتیجہ میں عوام میں اس کے خلاف

اپنے لشکرگاہ میں واپس ہو گئے۔

سردار اسعد اور سپہ سالار دونوں نے مل کر یہ طے کیا کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خاموشی کے ساتھ طہران روانہ ہو جائیں اور وہاں چپکے سے پہنچ کر شہر میں داخل ہو جائیں۔ یہ تجویز کئی وجوہات سے کامیاب معلوم ہو رہی تھی۔

(۱) کیونکہ بادشاہ نے ایک نئی تازہ دم فوج سرکاری فوجوں کی حمایت کے لئے بھیج دی تھی۔ اگر یہ جنگ ادامہ طویل ہو جاتی تو قومی فوجوں کی شکست یقینی تھی۔

(۲) شہر کی مضبوط چہار دیواری اور برجوں کے باعث شہر میں قومی فوجوں کے لئے علانیہ داخلہ تقریباً مشکل تھا۔ شہر میں فوجی استحکام بھی کافی تھے اس لئے بظاہر مقابلہ مشکل تھا۔

(۳) قومی سرداروں کو یقین تھا کہ ایک مرتبہ داخل ہو جانے کے بعد شہر میں مشروطہ کے مددگار ہماری مدد کے لئے مل جائیں گے۔

جذبۂ نفرت پھر پیدا ہو گیا۔

محمد علی شاہ ابھی فتح کے نشہ میں سرشار تھا کہ خزانہ خالی ہو گیا۔ داخلی فسادات کے باعث مالیانہ وصول نہ ہو سکا اور جو وصول بھی ہوا وہ امراء کی جیب میں گیا۔ اُدھر محمد علی نے فوراً آذربائیجان فوجیں بھیجنے کا حکم دیدیا۔ لیکن خرچ کہاں سے آتا۔ اگر فوجیں نہ بھیجی جاتیں تو اُسے اپنی بادشاہی چلے جانے کا یقین تھا۔ ہزاروں روپیہ بادشاہ نے اپنے پروپیگنڈہ کی خاطر طبقہ ملّا کو کھلایا اور ابھی ان کی شکم سیری نہیں ہوئی تھی اور لطف یہ کہ جب امراء کو اس امر کا علم ہوا کہ خزانہ خالی ہے اور انہیں اس امر کا ڈر ہوا کہ کہیں ان پر ٹیکس نہ لگا دیا جائے تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ لوگوں پر ٹیکس قانون اساسی کی بنا پر بغیر پارلیمینٹ کی اجازت کے کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا محمد علی شاہ نے قرضہ کیلئے دوڑ دھوپ شروع کر دی اور سعد الدولہ کو اسکے لئے یورپ بھیجا

(۴۲) ان کا خیال تھا کہ خاموشی سے داخل ہونے پر ہم آسانی سے مسجد سپہ سالار پر قبضہ کر سکتے ہیں جو ایک قلعہ کا کام دے گی۔

یہی سبب تھا کہ ابھی رات کا تھوڑا سا حصہ گزرا تھا کہ قومی فوجیں سفیدیٔ صبح نمودار ہونے سے قبل سپہدار اور سردار اسعد کی سرداری میں پایۂ تخت کی طرف روانہ ہو گئیں (حالانکہ دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ایک کلومیٹر سے کم فاصلہ پر تھیں۔

باوجود اس امر کے کہ طہران کی حفاظت کا انتظام غیر معمولی طور پر کیا گیا تھا اور اس کا ہر دروازہ بجائے خود ایک مضبوط قلعہ تھا۔ مشرقی اور جنوبی دروازوں کو فوج سے اور بھی مضبوط بنا دیا گیا تھا اور ہر دروازہ پر کئی کئی سو سپاہی موجود تھے کہ ایسا نہ ہو ان دروازوں سے قومی فوجیں داخل ہو جائیں۔

تمام شہر لیاخف کمانڈر فوج کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ میدان، توپ خانہ تمام جنگی سامان، گاڑیوں، ایمبولنس گاڑیوں، خچروں اور گھوڑوں سے پُر تھا۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس سے زائد فوجی مرکز (ذخائر) موجود تھے۔ جن میں ڈھائی سو فوجی سپاہی ہر وقت کیل کانٹے سے لیس کھڑے تھے۔

اس خبر نے ایرانیوں میں پھر ایک جوش پیدا کر دیا۔ ملک اور بیرونِ ملک ایک شور برپا ہو گیا۔ اخبارات نے سخت مقالات اس قرض کے خلاف لکھے۔ خود ایران میں یہ خبر عام ہو گئی کہ بادشاہ عوامی آزادی کو کچلنے کے لئے مزید روپیہ قرض لے رہا ہے۔ یہاں تک کہ دوسرے ممالک میں ایرانی مہاجروں نے سخت خطوط اخبارات میں بھیجے جن میں بادشاہ کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا ہو گیا۔

اب تو محمد علی شاہ نے اس امر کی سرتوڑ کوشش کی کہ علمائے ایران اور علمائے عراق سے اس قسم کے فتاویٰ حاصل کرے جو مشروطہ کو حرام کہہ سکیں تاکہ ایک طرف تو انگریز والے کو خاموش کیا جا سکے۔ دوسری طرف خود عوام کے جذبۂ آزادی کو ختم کر دیا جائے اور اس طرح آذربائیجان میں برپا ہونے والی بغاوت کو بھی دبا سکے۔

مختلف مقامات پر گہری خندقیں تیار تھیں جن میں بھاری توپیں نصب تھیں۔ نائب السلطنۃ۔ خیابان ماشین۔ قرآقا پر تین ہزار سپاہی الگ حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ میدان توپ خانہ جو بذات خود ایک محل مستحکم ہے جس کی دیواریں بہت بلند اور دیو آسا ہیں، خاص طور سے فوجوں کا مرکز بنا دیا گیا تھا۔

سرکاری عمارتیں اور گلستان (جو بذاتہ ایک مضبوط قلعہ کا کام دیتی ہیں) مسلح فوجیں اور حفاظتی گاردیں رکھ دی گئیں۔ نقارہ خانہ کی عمارت میں چند توپیں (کالیبر) رکھ دی گئیں۔

اس کے علاوہ قصرِ قاچار پر (جو طہران کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ بلند ہے اور خود ایک مستحکم قلعہ ہے) بھی چند (باطری) دور مار توپیں رکھ دی گئی تھیں۔ گویا تمام طہران اُن سے جل سکتا تھا۔

خود محمد علی شاہ نے سلطنت آباد میں قیام کر رکھا تھا اور اس کے تمام درباری بھی وہاں منتقل ہو گئے تھے جس کی حفاظت کے لیے کئی سو سپاہی اور سوار متعین تھے۔ اس طرح محمد علی شاہ نے آٹھ نو ہزار منظم سپاہیوں، مضبوط توپ خانوں اور اس کے علاوہ ہزاروں غنڈوں اور بدمعاشوں کو ایک مستحکم دیوار کی شکل میں تبدیل

لہٰذا جب انگریزوں کے دباؤ میں آکر قیام مشروطہ کا اعلان کیا تو دوسری طرف علماء کو بھڑکا دیا۔ مشروطہ کو حرام کہا گیا اور ایک بڑی لمبی عرضداشت بادشاہ کو پیش کی گئی جس پر تیس علماء کے دستخط تھے۔ ادھر محمد علی شاہ نے تاجروں کو بھڑکانے کے لئے مفاخر الملک کو حاکم طہران بنا دیا جس نے لوگوں کو اس قسم کی درخواست بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے مجبور کیا، کہ وہ بادشاہ کے ساتھ اظہارِ وفاداری کریں اور مشروطہ کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار بھی۔ بہرحال ایک وفد بھیجا گیا۔ اور جب بادشاہ کے سامنے وفد پیش ہوا اور بادشاہ نے درخواست سننے کے بعد کہا کہ اب ہم پارلیمنٹ کی تجدید نہ کریں گے تو اچانک اسی وفد میں سے ایک شخص نے اچانک کہا۔ "ایران تو مشروطہ کا طلبگار ہے۔" اس آواز نے تمام دربار اور وفد

کرکے مقابلہ کی پوری تیاری کرلی تھی ۔ تاکہ جس وقت سرکاری فوجوں کو شکست ہو اور قومی فوجیں شہر کی طرف آئیں تو طہران کو کسی قسم کی گزند نہ پہنچے۔

فتح طہران مجاہدین نے بہجت آباد کے دروازے سے داخل ہونا چاہا اور دستی بم کے ذریعہ بڑے دروازہ کو اکھاڑ ڈالا گیا اور اس طرح چند سپاہیوں کو قتل کرنے کے بعد آسانی سے شہر میں داخل ہو گئے اور وہاں سے پارلیمنٹ کی طرف چل پڑے ۔ اور راستہ میں فوجی چوکیوں پر قبضہ کرتے چلے گئے اور آسانی کے ساتھ مسجد سپہ سالار میں پہنچ گئے اور وہاں اطمینان سے بیٹھ کر پروگرام مرتب کیا۔ صبح ہوتے ہی سینکڑوں قومی حکومت کے طرفدار قومی فوجوں سے مل گئے اور اب شہر پورا محاذِ جنگ بن گیا اور شہر کے تمام حصوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی ۔ چونکہ دونوں طرف کے گروہوں کو اس آنیوالے دن کا انتظار تھا اور دونوں یہ سوچے بیٹھے تھے کہ تخت یا تختہ ۔ اس لئے ہر ایک نے جان کی بازی لگادی تھی ۔ شہزادوں سے لیکر ادنیٰ خادم تک کا گھر بجائے خود ایک قلعہ بن گیا تھا اور خود علماء شاہی جو اپنی عادتوں کے لحاظ سے جنگ سے علیحدہ رہتے ہیں ۔ حاجی شیخ فضل اللہ جیسوں نے جنگ کا پورا سامان کرلیا تھا سینکڑوں

دہشت طاری کردی لیکن محمد علی شاہ نے بات ان سنی کردی ۔ اور یہ وفد ناکام واپس آگیا۔ اُدھر محمد علی شاہ کو باہر سے قرض کی رقم نہ مل سکی۔ آخر کار اس نے روس اور انگریزوں کو بعض ٹھیکے مجبور ہو کر دیدیئے اور کچھ عمارتیں گروی رکھ دیں اور بعض امراء سے زبردستی روپے وصول کئے ۔ تب کہیں جاکر آذربائیجان کی مہم میں فوجیں روانہ کرسکا جہاں اس کے خلاف (پارلیمنٹ کے طرفدار) آزادی کے خواستگار اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

افراد اس کے ساتھ شریک تھے۔

لیکن تین روز کی شدید جنگ کے بعد میدان قومی فوجوں کے ہاتھ رہا اور تیسرے دن جبکہ شہر کا دو تہائی حصہ قومی فوجوں کے قبضہ میں تھا تو محمد علی شاہ نے یہ خبر سنتے ہی سراسیمہ ہو کر ۱۶ر جولائی کو ۸½ بجے صبح ایک کثیر التعداد فوج اور مصاحبین وغیرہ کے شہر سے بھاگ کر روسی سفارتخانہ میں پناہ لی۔ جو زرگندہ شہر سے چند میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اور اس طرح تخت سے دست بردار ہوا۔ بھاگنے سے پہلے اس نے روسی سفیر سے اجازت حاصل کر لی تھی۔ سفارتخانہ کی عمارت پر روسی جھنڈے چڑھا دیئے گئے۔ امیر بہادر اور مجلل السلطان بھی بادشاہ کے ساتھ سفارت روس میں پناہ گزین ہو گئے۔

اُس تمام رات شاہ بے قرار و بے چین رہا اور ملکہ اور بچہ کوئی بھی نہیں سویا۔ صبح کو سعد الدولہ کو سفارت روس میں بھیجا۔ اس وقت بادشاہ کو روسیوں کی طرف سے مایوس کن جواب ملا۔

بادشاہ کے سفارتخانہ میں پناہ گزین ہونے کے بعد روسی اور برطانوی سفیروں نے آکر قومی سرداروں کے پاس آکر بادشاہ کے پناہ گزین ہونے کی اطلاع دی اور کہا اب وہ ہماری حمایت میں آگیا ہے۔ دونوں حکومتیں اس کے جان و مال اور اس کے ساتھیوں کی حفاظت کریں گی۔

سرکاری فوج کے کمانڈر (روسی افسر) لیاخف نے آکر اپنی تلوار پیش کر دی اور اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔

فتح طہران میں ایرانیوں نے جس جانبازی اور جانی قربانی کا ثبوت دیا ہے

وہ بھی ایک حیرت انگیز تفصیل ہے۔ قومی حکومت کی حمایت کرنے والے چاہے کتنے ہی کم کیوں نہ تھے اور سامان بھی ان کے پاس ناکافی تھا۔ لیکن ایک چیز ان میں نمایاں تھی اور وہ تھی غیرتِ قومی یا قومی ایثار۔

حالانکہ خود امیر بہادر وزیر جنگ نے اعلان کر دیا تھا کہ انقلابیوں کے آنے سے پہلے میں شہر کو خاکستر میں تبدیل کر دوں گا۔ ظاہر ہے کہ اب جان کی بازی لگا کر ہی قومی فوجیں اور بے پناہ حملوں کے بعد ہی دشمن ہی سے اسلحہ حاصل کر کے فتح کا خواب دیکھ سکتے تھے۔

اس طرف نو ہمدرد تھے انہوں نے اپنے گھر کے اثاثہ تک بیچ دیئے اور گھر کا سامان رہن رکھ کر بندوقیں خریدیں اور اس دن کے منتظر تھے۔

پورا شہر اسلحہ خانہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ دونوں طرف کی تیاری بے حد تھی۔ لیکن پھر بھی سرکاری انتظامات کے مقابلہ میں ان کے انتظامات بہت کمتر تھے۔

قومی (حکومت کے) جانبازوں نے طہران میں تین مرکز بنا لیے تھے جس میں ہر ایک مرکز میں سرفروش انسان جمع تھے۔

(۱) جہانگیر (   ) میں جس کے سردار مستعان الملک تھے۔ تین سو سے زیادہ افراد تھے۔

(۲) انجمن برادران دروازہ قزوین۔ جو پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے اور شہر کے غربی دروازے پر تھے۔

(۳) انجمن احرار سر قبر آقا۔ جس میں بیچارے کاریگر اور معمولی دستکار لوگ تھے۔

ان لوگوں کے پاس ہتھیار نہ تھے تو انہوں نے گھر کا سامان بیچ بیچ کر تلواریں خریدیں۔ تعداد میں ستر آدمی تھے۔ یہ چونکہ سب انگریز تھے اور ان کے ہاتھ کالے تھے، اس لئے لوگ ان کو "مجاہدینِ سیاہ دست" کہتے تھے۔ یہانتک کہ ایک مجاہد نے تو اپنا سارا سرمایہ جو ایک پرانے قالین پر مشتمل تھا بیس روپے میں فروخت کر کے بندوق خریدلی۔ اور تین دن تک برابر لڑتا رہا اور جنگ کے خاتمہ پر چھ مہینے تک بستر پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ وہ آخری عمر تک لنگڑا چلتا رہا۔

خود انگریز مجاہدوں نے جو ایک سو افراد تھے، بڑی اولوالعزمی کے ساتھ اپنے ہی محلّے میں جنگ کی اور فوجی چوکی پر قبضہ کر لیا۔ اور سپاہیوں سے ہتھیار اتروانے کے بعد اُن کے ساتھ محبت سے پیش آتے رہے اور کھانا کھلانے کے بعد ان کو رہا کر دیا۔

غرض ان پاک دل سرفروش انسانوں نے تکلیفیں اٹھائیں، نقصانات برداشت کئے۔ لیکن اس کے باوجود کسی سے کوئی انعام نہیں چاہا۔ اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

غرض قومی فوجوں نے اس سے قبل کہ سرکاری لشکر ادامک سے آئے لیفرم خان کی سرکردگی میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیفرم خان خود ایک تجربہ کار اور کار آزمودہ شخص تھا۔ اس نے تین بختیاری سواروں کے ساتھ میدانِ سپہ (سابقہ میدان توپ خانہ) پر قبضہ کرنے کا پروگرام مرتب کر لیا۔ تمام بلند عمارتیں سرکاری فوجوں کے قبضہ میں تھیں۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے سب سے بڑی اور اونچی عمارت بنک کی چھت پر قبضہ کر لیا اور اس

کو ایک مضبوط جائے پناہ میں تبدیل کر کے تمام عمارتوں کو زیرِ نگاہ رکھ لیا۔ یہ کام اس قدر چابکدستی سے انجام پایا کہ دشمن بھی حیران رہ گیا۔ اور اس طرح انہوں نے ان تمام لوگوں پر حملہ کر دیا جو میدان یا مکانوں کی چھت پر تھے۔ میدانِ سپہ کا شمالی، غربی اور جنوبی حصہ ان کے قبضہ میں آ گیا اور شرقی دروازہ باقی رہا جس پر دو دن برابر جنگ جاری رہی۔

عربوں کے محلہ میں ایک انجمن روح القدس تھی، انہوں نے تیس آدمیوں کے ساتھ خیابان چراغ برق پر قبضہ کر لیا۔ دشمن سے ہتھیار چھین لئے اور فوراً اختیاری فوج کی امداد کو پہنچے اور نہ صرف ان کے ساتھ جنگ میں برابر شریک رہے بلکہ ان کی خوراک اور دیگر ضروریات بھی مہیا کیں۔

غرض اب چھپے ہوئے ہمدرد باہر نکل کر آنے لگے جن میں اسد اللہ خان ابوالفتح قابلِ ذکر ہیں، جنہوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیکر قومی فوج میں شرکت کی تھی اور پارلیمنٹ کے انہدام کے بعد گیلان چلے گئے تھے اور وہاں جا کر قومی فوج کے ایک رسالہ کے افسر بن گئے تھے۔ چونکہ وہ تمام فوجی چوکیوں سے واقف تھے اس لئے ان کی کوششیں اس سلسلہ میں بہت کام آئیں۔ میدان سپہ میں پہنچنے کے لئے انہوں نے میرزا حسن ادیب کے گھر کی دیوار توڑ کر خیابان سپہ کے جنوبی حصہ کی طرف اندر ہی اندر پہنچ گئے اور چند گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد انہوں نے اچانک ان پر حملہ کر دیا اور چوکی میں بم پھینک کر آگ لگا دی۔

دوسری طرف بختیاری فوج کے ایک دستہ نے ابوالقاسم مجاہد طہران کی سرکردگی میں ٹیلیگراف کی عمارت پر قبضہ کر لیا اور اس کے بلند مدرسہ دار الفنون

پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح اُن راستوں پر قابض ہو گئے جو میدانِ سپہ میں جاتے تھے۔

شہر میں ایک اور انجمن "انجمن برادران دروازہ قزوین" تھی جو میرزا سلیمان میکدہ صدر انجمن کی گرفتاری کے بعد خاموش ہو گئی تھی، اب اپنی سابقہ شرمندگی کو مٹانے کے لئے آگے بڑھ آئی تھی اور قومی فوجوں کے شہر میں داخل ہوتے ہی اس کے ممبران، دستوں میں تقسیم ہو کر ان سے ملتے گئے اور ہر ایک دستہ شہر کے ایک ایک حصہ پر بھیجا گیا اور وہاں انہوں نے سخت جنگ کی۔

تہران کی اس جنگ میں سب سے بڑا کام تبریز کی قومی فوجوں اور گیلان کے جوانمردوں نے کیا۔

شہر کی فوجوں کے پاس اسلحہ کی کمی نہ تھی لیکن ان میں جرأت کی کمی تھی اور مجاہدین کی اسی جرأت نے انہیں طہران پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے بلند چھتوں پر پہلے ہی قبضہ کر لیا۔ پناہ گاہیں بنالیں۔ سرکاری فوجیں بازاروں اور سڑکوں پر تھیں اور یہ بلندیوں پر تھے۔ لہٰذا ہر طرف سے ان پر اچانک وار کر کے ان کو حواس باختہ کر دیتے تھے۔ اور ایک ایک دستی بم نے سرکاری فوجوں کو بے حد نقصان پہنچایا۔

سرکاری فوجوں کے پاس توپیں ضرور تھیں لیکن سامنے کی لڑائی کم تھی اور گوریلہ جنگ کی حالت ہو گئی تھی۔ عمارتوں کو توپوں سے نقصان پہنچ رہا۔ لیکن مجاہدین دیواروں سے پناہ لیکر، گھروں میں بیٹھ کر دستی بموں سے کام لے رہے تھے اور اس طرح ان کو متفرق کر رہے تھے۔

لیفرم خان نے ایک اور اہم کام یہ کیا کہ شاہی طویلہ کو حاصل کرنے کے لئے پوری ہمت صرف کر دی ۔ یہ ایک مضبوط قلعہ کے مانند تھا۔ جس کا انتظام بذاتہ ایک بڑے سرکاری قلعہ کی مانند تھا۔ مزید کہ بادشاہ کی سرپرستی ان لوگوں کو حاصل تھی اس میں تقریباً دو ہزار مسلح آدمی تھے (جنہوں نے واقعہ میدانِ توپ خانہ میں ہنگامہ برپا کیا تھا)

مجاہدین نے خیابان علاء الدولہ کی شرقی عمارتوں پر قبضہ کر کے انہی دستی بموں کے ذریعہ دو گھنٹے کے اندر اندر شاہی طویلہ (اصطبل) کو تینوں طرف سے گھیر لیا اور اس طرح عمارت پر قبضہ کر لیا۔ اسی جنگ میں شام ہوگئی اور لیفرم خان نے اپنے جانبازوں کے ساتھ اس کے قریب بلند ترین عمارت کی چھت پر رات کو آرام کیا۔

دوسرے دن شہر کے چاروں حصّوں میں آگ پوری طرح بھڑک اُٹھی تھی۔ (سرکاری فوجوں کو ادامک سے آئی ہوئی فوجوں کی مدد مل گئی تھی۔ اور یہ طے کر لیا گیا تھا کہ پہلے توپوں سے شہر پر قبضہ کر لیا جائے۔ اُس کے بعد منظم طور پر پارلیمنٹ اور مسجد سپہ سالار پر قبضہ کر لیا جائے) لیکن قومی فوجوں کی آس نہ ٹوٹی۔ شاہی طویلہ پر قبضہ کی خبر نے سرکاری فوجوں کے اور بھی ہوش و حواس اڑا دیئے۔ اور اب انہوں نے توپوں سے تمام شہر کو گھیر لیا۔ سرکاری فوجوں نے تین مرتبہ پوری شدت کے حملہ کے بعد بھی کامیابی حاصل نہیں کی۔ البتہ ان کا پلہ سرکاری تازہ دم فوجوں کے مقابلہ میں ہلکا رہا۔ البتہ ظہر کے قریب چار بجے سہ پہر سردار معز السلطان، میرزا علی محمد خاں تربیت، میرزا کوچک خاں، کہ تینوں قومی

فوجوں کے اعلیٰ بہادر تھے، نئی کمک کے ساتھ آگئے اور شہر کا دو تہائی حصہ سورج غروب ہونے سے قبل قومی فوجوں کے ہاتھ میں تھا۔

تیسری رات کو طے پایا کہ کل رات پانچ سو مجاہدین سلطنت آباد (جہاں شاہ مقیم تھا اور دو ہزار سپاہی حفاظت کے لئے مامور تھے) پر حملہ کرکے بادشاہ کو گرفتار کریں اور دن میں مجاہدین اسلحہ کی کمی کے سبب احتیاط سے کام لیں اور بیکار کارتوس ضائع نہ کریں۔

تیسرا دن اور آخری دن :- شہر کا مشرقی اور شمالی حصہ قومی فوج کے قبضہ میں تھا اور شمالی طرف سے لیفرم خان کی فوجیں جنوب کی طرف سے اسد اللہ ابوالفتح کی سپاہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ مغربی طرف سے بختیاری فوج نے قبضہ کرلیا تھا۔ اور مشرقی سمت سے میرزا علی محمد خان تربیت اور میرزا کوچک نے فوجی چوکی کے سامنے مدرسہ المان پر قبضہ کرلیا تھا اور ابھی تک لیاخف بھی اپنی فوجوں کو ایک اور مضبوط اور خاموش حملہ کے لئے تیار کررہا تھا۔

اب سرکاری توپوں میں وہ شدت نہ تھی۔ لیکن مجاہدین کو ان توپوں کی پرواہ نہ تھی اور وہ بہت احتیاط سے لڑ رہے تھے۔ بلند ترین عمارتوں پر قبضہ کرکے سرکاری فوجوں کی ہمت شکنی کردی تھی۔ آخر کار ۱۳ رجولائی سنہ ۱۹۰۹ء کو طہران پر قومی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ محمد علی شاہ ۱۶ رجولائی سنہ ۱۹۰۹ء کو تخت سے دست بردار ہوگیا۔ ۱۸ رجولائی کو (شیخ فضل اللہ نوری اور دوسرے مخالفین کو پھانسی دی گئی) اور ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء کو دوبارہ مجلس ملی کے افتتاح کا اعلان ہوا۔

قیام مشروطیت

اکتوبر کے مہینے میں مجلس کے ممبروں کا انتخاب شروع ہوا اور ۲۸ر اکتوبر تک ۶۴ ممبر ملک کے مختلف مقامات سے منتخب ہو کر طہران جمع ہو گئے۔ یہ دوسرا انتخاب ہر لحاظ سے پوری آزادی کے ساتھ ہوا۔ اور کسی نے انتخاب کے سلسلہ میں شکایت نہیں کی اور یہی بات صحیح ہے کہ دوسری مجلس پارلیمنٹ ایران کی بہترین نمائندہ جماعت تھی اور اس کے نمائندہ اپنی صفات وصلاحیت کے اعتبار سے ۱۵ر نومبر ۱۹۰۹ء کو مجلس کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ جس میں ہر طبقہ کے وکلاء شریک تھے۔ سپہدار وزیر اعظم اور وزیر صیغۂ جنگ مقرر ہوئے۔

احمد شاہ قاچار
۱۹۰۹ء ـ ۱۹۲۵ء

احمد شاہ قاچار پسر محمد علی شاہ چونکہ ابھی کمسن تھا۔ اس لئے عضد الملک نائب السلطنۃ مقرر ہوا۔ لیکن وہ ۲۲ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو فوت ہو گیا۔ اس کی جگہ میرزا ابو القاسم ناصر الملک نائب السلطنۃ مقرر ہوا۔ اسی زمانہ میں حکومتِ ایران نے اپنے محکمۂ مالیات کو منظم کرنے کے لئے امریکی ماہرین مالیات کی خدمات حاصل کیں اور وہاں سے ایک مالیاتی مشن مسٹر مارگن شوسترکی سرکردگی میں ایران آیا۔ ۱۲ر مئی ۱۹۱۱ء کو مسٹر شوستر محکمۂ مالیات کا خازن اعلیٰ مقرر ہوا۔ امریکی مالیاتی مشن نے نہایت دیانت داری کے ساتھ اپنے محکمہ میں اصلاح کا کام شروع کیا۔ لیکن ان کا یہ کارنامہ روس اور برطانوی حکومتوں کے مفاد کے خلاف تھا اور یہ حکومتیں ان کے

کام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔

اس دوران میں سابق شاہ ایران محمد علی نے حکومتِ روس سے خفیہ طور پر فوجی امداد حاصل کی جس کے عوض میں اس نے روسیوں کو صوبۂ آذربائیجان اور بحر خزر کا ایرانی ساحل دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ وہ بھیس بدل کر ایران میں داخل ہوا اور ایک نئے لشکر کے ساتھ پایۂ تخت پر قبضہ کرنے کے لئے شمال کی جانب سے طہران کی جانب بڑھا۔ مغرب کی طرف اس کے بھائی سالار الدولہ نے ۱۲ر جولائی ۱۹۱۱ء کو کرمان شاہ اور ہمدان پر قبضہ کر لیا۔ محمد علی کا بہترین سپہ سالار ارشد الدولہ اچانک طہران کے قریب پہنچ گیا۔ قومی فوج اس کے مقابلہ کے لئے نکلی اور اس کی پہلی جنگ ۱۲ر اگست ۱۹۱۱ء کو فیروز کوہ کے مقام پر ہوئی جس میں محمد علی کی فوج کو شکست ہوئی اور اس کا سپہ سالار گرفتار ہو کر توپ سے اڑا دیا گیا۔ دوسری جانب قومی فوج نے شہر قم کے قریب سالار الدولہ کی فوج کو شکست دی جس کے بعد محمد علی میرزا مایوس ہو کر ایران سے واپس چلا گیا۔

جب محمد علی میرزا کے ذریعہ سے حکومتِ روس کی آرزو پوری نہ ہوئی تو اس نے نومبر ۱۹۱۱ء میں حکومت ایران کو الٹی میٹم دے دیا جو حسب ذیل شرائط پر مشتمل تھا۔

۱۔ حکومت ایران امریکی مالی مشیروں کو ایران سے نکال دے۔

مسٹر شوسٹر نے ایرانی مالیات کے درست کرنے میں بہت سرگرمی کا اظہار کیا تھا اور تحفظ ایران کے لئے ایک علیحدہ قومی فوج بنائی تھی (رضا شاہ مرحوم اسی فوج میں بھرتی ہوئے تھے)۔ یہی امر [illegible] کی ناراضگی کا باعث بنا۔

۲۔ حکومت ایران روس اور برطانیہ کے مشورے کے بغیر کسی بیرونی مشیر کو اپنے ملک میں نہ بلائے۔

۳۔ حکومتِ ایران روس کو تاوانِ جنگ ادا کرے۔

سیاسی مجبوریوں کی بنا پر حکومتِ ایران کو یہ الٹی میٹم منظور کرنا پڑا۔ چنانچہ امریکی مالی مشیر ایران سے چلے گئے۔

الٹی میٹم منظور کرنے کے بعد ملک کے بعض حصوں میں پھر بدامنی شروع ہوگئی اور روسی فوجیں قیام امن کے بہانے سے تبریز، قزوین اور اصفہان میں داخل ہوگئیں۔

۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اوّل کے موقع پر ایران نے اپنی غیرجانبداری کا اعلان کیا۔ لیکن پھر بھی بیرونی اثرات سے آزاد نہ رہ سکا۔ روسیوں نے ایران کے شمالی حصے اور انگریزوں نے جنوبی حصّے پر بدستور اپنے قبضے رکھے تاکہ ترسیلِ جنگ کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔

۱۹۱۵ء میں دونوں ملکوں کا نیا معاہدہ ہوا اور کم و بیش تمام علاقہ ہی ان کے قبضہ میں آگیا۔ دونوں ملکوں نے ایران میں اپنی زیرِ نگرانی فوجی ڈویژن قائم کردیئے (یہ سلسلہ ۱۹۱۹ء تک جاری رہا۔

اسی دوران روس میں انقلاب رونما ہوا جس کے نتیجہ میں زار روس کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور بالشویک برسرِاقتدار آگئے۔ روس کی نئی حکومت نے ان تمام معاہدات کو منسوخ کردیا جو زارِ روس کے زمانہ میں حکومتِ ایران سے کئے گئے تھے۔

۱۹۱۷ء میں زاریت کے خاتمہ پر روس کے اثرات کم ہوئے تو برطانیہ نے اس

صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایران پر اپنے اثرات جمانے شروع کر دیئے۔ برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کرزن نے ایران کو پوری طرح برطانیہ کے قبضہ میں لانے کے لئے مختلف کوششیں کیں تاکہ خلیج فارس سے بحر کیسپین تک تمام حصہ برطانیہ کے زیرِ اقتدار لاکر اسے برطانوی ہند کا ایک سرحدی صوبہ قرار دے دیا جائے۔

چنانچہ ۱۹۱۸ء میں جب ترکوں کو شکست ہوئی تو برطانیہ نے ایران کے خاص خاص مقامات پر اپنی فوجیں متعین کر دیں۔ ایران کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ انگریزوں سے نیا معاہدہ کیا جائے۔ اس نئے معاہدے کے باعث ایران عملی طور پر انگلستان کے زیر اثر آ گیا۔ اور اس کے نتیجہ میں دو لاکھ پچیس ہزار پونڈ ماہانہ دینا منظور کیا۔

جب جنوری ۱۹۱۹ء میں یہ معاہدہ شائع ہوا تو اس معاہدہ کے شائع ہوتے ہی ملک میں شدید ردعمل ہوا۔ یہاں تک کہ خود شاہِ ایران نے بھی اس کی مخالفت کی۔ سلطان واقعتاً ان واقعات سے تنگ آ چکا تھا۔ اس کی شاہانہ طبیعت اس کی نوعمری کے باعث ان دشواریوں کا حل تلاش نہ کر سکی۔ یہاں تک اس نے ایران کو چھوڑ کر چلے جانے کا ارادہ کر لیا تاکہ اہل ایران خود اپنے معاملات کو طے کر لیں۔ لارڈ کرزن نے پارلیمنٹ میں ایران کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے کہا" درحقیقت ایران کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ اپنی قسمت اور سرنوشت کا تعیّن ہماری مدد سے کرے۔"

انگریزوں نے سلطان کو یورپ آنے کی دعوت دی اور سلطان قرض کے

بل بوتے پر یورپ روانہ ہو گیا جہاں اس کا عظیم الشان شاہانہ استقبال کیا گیا۔ اور اس طرح اس کو رام کرنے کی کوشش کی گئی۔

دوسری طرف انگریزوں کو اس معاہدہ کی توثیق کے لئے ایرانی پارلیمنٹ کی تصدیق کی ضرورت تھی۔ لیکن ملک میں شدید ردعمل کے سبب وزیر اعظم وثوق الدولہ کو (جو اس معاہدہ کا محرک تھا) مستعفی ہونا پڑا اور حسن پرنیا (مشیر الدولہ) وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ موصوف آزادی خواہوں کے نمائندے تھے۔ اور وثوق الدولہ کی اس پالیسی کے مخالف بھی، اسی لئے اس معاہدہ کی تصدیق نہ کر سکی۔ انگریزوں کو اس واقعہ سے اس قدر مایوسی ہوئی کہ انہوں نے "خاموش انقلاب" لانے کے لئے راہیں ہموار کرنی شروع کر دیں۔

خاموش انقلاب | اس انقلاب کے خارجی طور پر ہیرو انگریز اور سی کٹر اور داخلی طور پر خود سیاستدانوں کا گروہ میرا کوچک خان جنگلی سردار اسعد اور سالار جنگ تھے۔

سیاستدانوں کے گروہ میں علامہ سید حسن طباطبائیؒ (جو سید حسن مدرس کے نام سے مشہور تھے) خاص طور پر شامل تھے وہ ۱۹ء کے معاہدے کے سخت مخالفین میں سے تھے اور سید ضیاء الدین طباطبائی جو اس معاہدے کے موافقین میں سے تھا۔ انگریزوں نے سید ضیاء الدین کی بے حد حمایت کی۔ اس انقلاب کو بروئے کار لانے کے لئے ان کا روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اور سید ضیاء الدین کا دماغ تمام راہیں ہموار کر رہا تھا۔

سید حسن مدرس کو اس لئے شامل رکھا گیا تھا کہ ان کا تعاون شامل حال ہے۔

لیکن آزادی خواہ گروہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے ملک کو غیروں سے آزاد رکھیں اس لئے وہ اس مقصد میں انقلاب لانے والوں کا ساتھ نہ دے سکے (اسی لئے اس انقلاب کے آتے ہی سید حسن مدرس کو گرفتار کر لیا تھا) سید ضیاء الدین طباطبائی کو انگریزوں کی حمایت حاصل تھی۔ بلاشبہ وہ ایک باا ثر اخبار نویس بھی تھے اور سیاستداں بھی، اسی لئے انگریزوں نے اپنے مقصد کے لئے اُسے چن لیا۔ قزوین میں انقلاب کی تمام جزئیات طے کی گئیں اور باقاعدہ پروگرام مرتب کیا گیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے رضا خان کی خدمات حاصل کی گئیں اور ۱۹ر فروری ۱۹۲۱ء کو یہ انقلاب اس قدر منظم طور پر عمل میں لایا گیا کہ خود وزیر اعظم اس واقعہ سے بے خبر رہے اور جبکہ قزوینی فوجیں ایران کے قریب رات کے وقت پہنچ گئیں۔ تب جا کر معلوم ہوا کہ ان فوجوں کی آمد کا کیا مقصد ہے۔ بادشاہ کے بار بار حکم کے باوجود فوجیں آگے بڑھتی رہیں۔ اور شب ہی میں شہر کے تمام اہم مقامات پر فوج نے قبضہ کر لیا۔ ڈاکخانہ اور تار گھر پر قبضہ کر کے سنسر لگا دیا گیا۔ شہر کے تمام روابط منقطع کر دیئے گئے اس طرح تقریباً تین ہزار سپاہیوں کی مدد سے یہ خاموش انقلاب آگیا۔

۲۴ر فروری ۱۹۲۱ء کو خاموش انقلاب آنے کے بعد نئی حکومت کی تشکیل ہوئی۔ سید ضیاء الدین وزیر نخست (وزیر اعظم) مقرر ہوئے اور رضا خان سردار سپہ۔ تمام احکامات سپہ سالار کے نام ہی سے جاری ہوئے۔ اس کے طہران کے ذی اثر لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہاں تک کہ شاہی خاندان کے افراد بھی پکڑے گئے۔ شہر کے تمام اخبارات بند کر دیئے گئے۔

بعد میں انقلاب لانے والے افسروں اور فوجی سپاہیوں کو ایک خطیر رقم دی گئی۔ بعض ذی اثر لوگوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ مخصوص اہلِ دولت پر آزاد ہونے کے لئے ایک خاص ٹیکس لگا دیا گیا۔

نئی حکومت نے ۲۷ فروری سنہ ۱۹۲۱ء کے اعلامیہ میں اپنی بعض اصلاحات کا ذکر کیا۔ اور اسی اعلان میں ایران و انگلستان کے معاہدہ کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اعلامیہ میں غیر ملکی فوجوں کا انخلاء بھی لازمی قرار دیا گیا۔

اس انقلابی حکومت کے نتائج اچھے ثابت ہوئے (۱) مختلف وزارتوں کی اصلاح کے لئے کمیشن مقرر کئے گئے۔ (۲) شہر طہران کی اصلاحات کے لئے بھی کمیشن مقرر کیا گیا۔ اور تقریباً ایک ماہ کے بعد ڈاک خانہ، تار گھر، ٹیلیفون آفس کھول دیئے گئے۔ عدالت نے کام شروع کر دیا اور اخبارات بھی جاری گئے۔ (۳) انگلستان سے مالی مشیر، امریکہ سے مشیران زراعت اور فرانس سے مشیران برائے عدالتی امور بلائے جانے تجویز ہوئے۔

(۴) افیون کا استعمال قطعاً بند کر دیا۔

(۵) ہر قسم کی شراب کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔

(۶) تمام دوکانوں کے بورڈ فارسی زبان میں لکھنا لازمی قرار دیا گیا (کاش پاکستان اس واقعہ سے ہی سبق لے)

(۷) جمعہ کی تعطیل لازمی قرار دی گئی۔

(۸) اجناس خوردنی کی سختی سے نگرانی کی گئی۔

(۹) کاشتکاروں کے حق کو تصرف کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا۔

لیکن اس کے باوجود خود انقلاب لانے والوں میں اختلاف پڑ گئے۔ رضا خان اور سید ضیاء الدین میں اختلافات وسیع ہو گئے۔ رضا خان کو تو اس امر کا احساس ہو گیا کہ دراصل میں ہی اس انقلاب کو کامیاب بنانے والوں میں سے ہوں۔ اور سید ضیاء الدین نے چونکہ شاہ کے کئی اعزہ کو قید کر دیا تھا اور کئی گورنروں کو بھی معزول کر دیا تھا جن میں خود ڈاکٹر مصدق گورنر فارس بھی تھے۔ اس لئے شاہ کی ناراضگی ضیاء الدین سے زیادہ ہو گئی۔ مزید برآں یہ کہ خود ضیاء الدین کو کسی پارٹی کی عملاً مدد شامل حال نہ تھی۔ رضا خان نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ کی تمام ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ ضیاء الدین کی کابینہ بھی ان با اثر لوگوں پر مشتمل نہ تھی جو امور سلطنت کو سنبھال لیتے، اور پارلیمنٹ کا افتتاح بھی ہو جاتا۔

سید ضیاء الدین کو جب اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اس نے رضا خان کے اختیارات کم کرنے چاہے۔ لیکن اس امر میں اُسے کامیابی نہیں ہو سکی۔ یہاں تک کہ رضا خان سردارِ سپہ سے وزیر جنگ بن گئے۔

روسیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور انگریزوں کو نیچا دکھانے کے لیے غیر معمولی دانائی کا ثبوت دیا۔

(۱) ایران کے ذمہ جو قرض تھا وہ معاف کر دیا۔

(۲) روس کا امپریل بنک ایران کے سپرد کر دیا گیا۔

(۳) جلفا ریلوے ایران کو دے دی گئی۔

(۴) ایرانی علاقہ کو بھی خالی کر دیا گیا۔

خود بادشاہ کے کان کابینہ کے خلاف بھرے جس کے نتیجے میں احمد شاہ اور رضا خان وزیر جنگ دونوں نے سید ضیاء الدین کی حکمتِ عملی کی مخالفت کی اور اس سے استعفیٰ طلب کر لیا گیا۔ سید ضیاء الدین ۲۵ مئی ۱۹۲۱ء کو طہران سے چلا گیا اور یورپ پہنچ گیا۔

بلاشبہ ضیاء الدین کی ذہانت قلم کے ذریعہ ایران کو جگاتی رہی۔ لیکن سیاست کی گتھیاں سلجھانے میں وہ عملاً کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی وجوہ کچھ بھی ہوں۔ رضا خان نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا۔ شاہ کی ہمدردیاں اپنے ساتھ برقرار رکھیں اور اپنی وطن پرستی، بہادری، اولوالعزمی کے سبب وہ سردار سپہ سے وزیر جنگ تو بن چکے تھے۔ اس ذمہ داری کو انہوں نے ہوشیاری اور خوش اسلوبی سے نبھایا، یہاں تک کہ وزیر اعظم بن گئے۔ ادھر احمد شاہ کی اخلاقی کمزوریاں اور سلطنت سے عدم دلچسپی نے عوام سے ان کو دور کر دیا تھا۔ یورپ ایک مرتبہ تو قرض لے کر جا چکے تھے۔ رضا خان نے بے حد کوشش محنت اور ذہانت سے عوام کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں دوبارہ احمد شاہ قرض لے کر یورپ روانہ ہو گئے اور دو سال تک دادِ عیش دیتے رہے۔

انھیں اپنے ملک کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا کہ ۱۹۲۵ء میں ایرانی پارلیمنٹ نے رضا خان کو بادشاہ چن لیا۔

اس طرح خاندانِ قاچاری کا خاتمہ ہوا اور ایک نئے خاندان "دودمان پہلوی" کے نام سے بادشاہت کا آغاز کیا۔

باب نہم

دودمانِ پہلوی

"رضا شاہ کبیر"

ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

رضا خان مرحوم کے والد کا نام   تھا۔ جن کا تعلق سوادِ کوہ کی پالانی قوم سے تھا۔ یہ صوبۂ مازندران کا ایک قدیم خاندان تھا۔ رضا خان کے بچپن کے دن اپنے ماموں کے گھر گذرے اور وہیں ان کی پرورش ہوئی۔ رضا شاہ مرحوم پندرہ سال کی عمر میں اُس ایرانی فوج میں شامل ہو گئے تھے جو امریکی مالی مشیر مسٹر شوسٹر نے قومی تحفظ کے لیے جدید طرز پر قائم کی تھی، مسٹر شوسٹر روسی دباؤ کے تحت ایران میں زیادہ دیر ٹھہر سکے۔ لیکن انہوں نے مستحکم بنیادوں پر اس فوج کی بنیاد رکھی تھی۔ رضا شاہ کی فراست اور کارکردگی کا اندازہ انھیں اس حد تک ہو گیا تھا کہ انہوں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ یہ نوجوان ایک دن اپنے ملک کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے اہل ثابت ہو سکے گا۔ انہوں نے رضا خان کے خوش آئند مستقبل

کے متعلق جو پیش گوئی کی تھی وہ بالآخر پوری ہو کر رہی۔

صرف یہ بات نہیں ہے کہ رضا خان مرحوم صرف قسمت کے بل بوتے پر بادشاہ بن گئے۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور لیاقت کا پورا ثبوت دیا، اور نئی ذمہ داریوں کا اہل ثابت کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دی، بلاشبہ بقول ملک الشعراء بہار وہ ایک عام حیثیت کے مالک تھے، ان کی پرورش بھی عسرت میں ہوئی۔ لیکن وہ ہمت مرداں مددِ خدا کے اصول کے مطابق آگے ہی بڑھتے رہے اور سرفروشانہ زندگی سے ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے ۱۹۱۹ء میں میجر کے عہدے پر فائز تھے، مرکزی حکومت کی طرف سے گاہ بگاہ بغاوتوں کے فرو کرنے میں اہم حصہ لیا۔ اس طرح انگریزوں اور روسیوں نے تاڑ لیا کہ یہ مردِ مجاہد انقلابِ جدید کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ بالآخر یہ امر تو ہو کر رہا لیکن رضا خان نے ایران کے ساتھ اپنی وفاداری کو ہمیشہ عملاً برقرار رکھا اور انہوں نے آخرکار انگریزوں اور روسیوں سے ملک کو پاک کر کے دم لیا۔

۲۴ فروری ۱۹۲۱ء کو خاموش انقلاب لانے کے بعد رئیس دویژون قزاق اعلیٰ حضرت اقدس شہریاری و فرمانده کل قوار کہلاتے اور کل فوجی احکام انہیں کے نام سے جاری ہوتے۔ رضا خان کی اولوالعزمی کے سامنے ایک وسیع میدان عمل تھا۔ سردار سپہ سے بعد میں وزیر جنگ مقرر ہوئے اور پھر وزیر اعظم بن گئے۔ ۱۹۲۳ء میں احمد شاہ قاچار نے اغیار کی دخل اندازیوں سے تنگ آ کر قومی مفاد سے کنارہ کشی کر کے دادِ عشرت دینے کے لئے یورپ کی راہ لی۔ یہ سفر بھی قرض کے بل پر کیا گیا۔ دو سال تک تقریباً وہیں رہے۔ ادھر رضا خان نے

پارلیمنٹ سے اعتماد حاصل کرلیا۔ جس کے نتیجہ میں ۱۹۲۵ء میں ایرانی پارلیمنٹ نے احمد شاہ کو تاج و تخت سے محروم کردیا اور رضا خان کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا گیا۔

رضا شاہ مرحوم کی رگوں میں ایرانی خون دوڑ رہا تھا۔ وہ وطن کی محبت میں سرشار تھے، بلاشبہ وہ ایک سپاہی تھے اور انہیں اس پر ناز بھی تھا۔ وہ سپاہیانہ انداز میں آگے بڑھنا پسند کرتے تھے۔ ایک سپاہی کے لئے ذہنی طور پر ان نفاستوں کا مالک ہونا ضروری نہیں ہوتا، جو ایک امن پسند اور پُرسکون شہری اپنے دماغ کی گہرائیوں میں رکھتا ہے۔ اسی لئے ان کی منزل کٹھن تھی اور ملک میں نئی اصلاحات کا اجرا، علماء کے بڑھے ہوئے اثرات اور تعلیم میں عام کمی کے سبب وسائل کی دشواریوں کے ساتھ مشکل ہی نہیں، تقریباً ناممکن تھا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے لئے بعض آسانیاں بھی تھیں۔ ان کا ملک ذہنی طور پر مغرب سے متاثر تھا۔ جغرافیائی حالات نے ترکی کو مغرب سے قریب تر کردیا تھا۔ عثمانی حکومت کا دائرہ صرف ایشیاء تک محدود نہ تھا۔ اس لئے ترکی انیسویں صدی میں مغربی اصلاحات اور تحریکات سے براہِ راست متاثر ہوچکا تھا۔ اس کے برخلاف مغربی ممالک سے ایران کا واسطہ براہِ راست ۱۸۰۷ء سے شروع ہوا۔ جب نپولین نے فتح علی شاہ کے دربار میں اپنا مشن بھیجا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کے خلاف ایرانی فوجوں کو مسلح کیا جائے۔ یا پھر انیسویں صدی کے آخر میں ایران کے اعلیٰ طبقے نے یورپ جاکر وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ

بھیجا۔

رضا شاہ پہلوی براہِ راست مغربی تحریکوں سے الگ تھے۔ البتہ وطن کی محبت نے ان کے دل میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا۔ وہ ایران کو اُسی طرح ایک عظیم الشان سلطنت بنانا چاہتے تھے جیسا کہ کسی زمانہ میں تھی۔ انہوں نے اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے کی اپنی پوری قوتِ ارادی سے کام لیا اور اپنی ذات سمیت پوری قوم کو تیزی سے راہ عمل پر چلایا۔ اور ایسی قوم کے لئے جس کے پاس وسائل ہی نہ ہوں، ایسی راہ پر چلنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

ان کی زندگی کا مقصد عیش کوشی نہ تھا۔ اس لئے ان کی زندگی ریاضت سے پُر تھی، وہ تو ایران کو ایک مستحکم حکومت دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہر ہر فرد پر ان کی نگاہ تھی۔ ایران کا وسیع و عریض خطہ ان کی براہِ راست نگرانی کے سبب کفِ دست کی مانند تھا۔ ناممکن تھا کہ کوئی سرکاری افسر کوئی کام کرے اور شاہ اس سے غافل ہوں۔ شاہنشاہیت کے بڑھے ہوئے اختیارات نے بلاشبہ ان کے لئے عملاً دشواریاں پیدا کر دی تھیں۔ لیکن ان کی دھن، کام کی لگن اور جفاکشی نے ایسی مثالیں تاریخ میں ثبت کر دی ہیں جو ان کی اولوالعزمی کی بین دلیل ہیں۔ وہ اپنے کاموں میں اس قدر خود اعتماد تھے کہ اُسے کسی دوسرے پر چھوڑنا نامناسب خیال کرتے تھے۔ سرکاری دفاتر کی براہِ راست نگرانی ان کے اصولوں میں شامل تھی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ عملہ کے افراد وقت پر آتے ہیں یا نہیں، خود مقررہ وقت پر بلا اطلاع دفتروں میں پہنچ جاتے تھے۔ انہوں نے انتظامیہ کی یکسر تشکیل کی اور تمام امور میں ضابطوں کا بے حد خیال

رکھا گیا۔

مشکل کی بات یہ تھی کہ وہ جس جذبے، بلند ہمتی اور پُر حوصلگی کا اظہار خود کرتے تھے، دوسروں سے بھی اسی معیار پر چاہتے تھے اور دوسرے اس معیار پر کم اترتے تھے۔ وہ ایران کو ایک عظیم الشان سلطنت بنانے میں افراد کو مشین کی طرح آمادۂ کار رکھنا چاہتے تھے اور ملت کی ترقی کے لئے افراد کو مشین کا پرزہ ہی سمجھتے تھے۔

شاہ کے مزاج میں غیر معمولی طور پر شک تھا۔ اس لئے بڑے سے بڑا آدمی اس شک و شبہ سے نہیں بچ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ تیمور شاہ جو دس سال تک شریک کار رہا اور خاص الخاص دوست بھی، وہ بھی شک و شبہ سے نہ بچ سکا جس کے نتیجہ میں وہ مروا دیا گیا۔ لیکن اس واقعہ سے ان کے دل و دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ اب ہر شخص ان کی نگاہ میں مشتبہ ہو گیا۔ دوستوں سے وہ کنارہ کش ہو گئے اور اب ان کا مقصد یہ تھا کہ ہر شخص بلا چون و چرا ان کا حکم ملنے اور ان کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ بسا اوقات یہی خود مختارانہ طریق حکومت استبدادیت کو جنم دینے کا سبب بن جاتا ہے۔

رضا شاہ مرحوم کو دنیاوی عیش سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ تو درباری لوگوں سے بھی دور ہی رہتے تھے۔ بلاشبہ شاہ محبت کے جذبات سے یکسر خالی نہ تھے لیکن سپاہیانہ اندازِ مزاج نے غیر معمولی سختی پیدا کر دی تھی۔ صحیح تو یہ ہے کہ ایران کی گری ہوئی حالت سدھارنے کے لئے ایک سخت گیر بادشاہ کی ضرورت تھی۔ اسی لئے جب رضا شاہ نے ایران کی آزادی کو قائم رکھنے، اور

اور اصلاحاتِ ملکی کے لئے اقدامات کئے تو انہیں بھی بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی سخت گیر پالیسی نادر شاہ کے مثل نہیں تھی۔ بلکہ ان کا مقصد ملک کو ترقی کے راستوں پر لگانے کے لئے پر امن اقدامات کرنا تھا۔ البتہ جو رکاوٹیں راستے میں آئیں انہوں نے اپنے مضبوط ارادے کے سبب ان سب کو دور کر دیا۔

ایران کے مختلف منطقے اور خطے جداگانہ حیثیت کے مالک تھے اور مرکز سے واسطہ کم تھا۔ رضا شاہ نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ مرکزی حکومت کو نئے سرے سے منظم کیا تاکہ مضبوط مرکز نظامِ حکومت درست رکھ سکے۔ سول انتظامات کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ فوج کو بھی منظم کیا گیا۔ اور اس کی تنظیم کے لئے فرانس سے مدد لی گئی۔ انہیں نظم و ضبط کا خیال سب سے زیادہ پیش نظر رہتا تھا۔ اسی لئے ایک مرتبہ اپنی خرابیٔ صحت کے باوجود فوج کی سلامی لینے کے لئے گھنٹوں تنے کھڑے رہے تاکہ ایک باوقار فوج کے سامنے ان کی کمزوری اور ناتوانی کا مظاہرہ نہ ہو سکے۔

باغی قبائل کو مطیع کرنے کے لئے ان کو منظم طور پر آباد کرنے کی ضرورت تھی۔ پس ان کو الگ الگ مقامات پر آباد بھی کیا گیا۔ اس طرح اُن کی اندرونی خود مختاری کو ختم کر دیا گیا اور غیر مسلح بھی۔ اس کے بعد بعض قبائل کو مویشی پالنے کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ بعض کو اپنی زراعتی زمین پر آباد کر کے ان کی شورہ پشتی کو ختم کر دیا گیا۔

اندرونی امن کے لئے پولیس کے محکمہ کی تنظیم ضروری تھی۔ لہذا ایک منظم

پولیس فورس کی بنیاد رکھی گئی اور راستوں کی حفاظت کے لئے بھی الگ پولیس بنائی گئی۔ جیسا کہ شاہ عباس اوّل کے زمانے میں راستوں کی حفاظت کے لئے منظم پولیس کا قیام عمل میں آیا تھا۔

لوگوں پر کڑی نگرانی رکھنے کے لئے خفیہ پولیس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہی محکمہ دراصل شاہ کی عظیم قوت کا سبب بنا۔ اور اسی محکمہ کے سبب حکومت کی مشینری پر اس کا قبضہ تھا۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ بھی شاہ کے وسیع اختیارات کی بنا پر صرف نام کی پارلیمنٹ تھی۔ شاہ کو اپنے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے پارلیمنٹ کی پروانہ تھی۔ اس لئے پارلیمنٹ پر عملاً قبضہ کرنے کے بعد سماجی حالات کی اصلاح کے لئے قدم آگے بڑھایا۔

سابق شاہی خطابات ختم کر دیئے گئے اور آہستہ آہستہ پرانے خاندانوں کے افراد جو وراثتاً عہدوں کے مالک چلے آتے تھے، ہٹا دیئے گئے۔ علماء کے بڑھے ہوئے اقتدار کو ختم کیا گیا۔ اور تجارت پر بھی حکومت کا قبضہ ہو گیا۔

روسی فوجوں کے چلے جانے کے بعد انگریز بھی اپنی فوجوں کو وہاں سے ہٹانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس لئے بیرونی اثرات کے خاتمہ کے بعد اب اندرونی اصلاحات کا کام تیزی سے شروع تھا۔ شاہ کی اصلاحات نے جہاں ایک طرف ملک کو اندرونی طور پر مضبوط بنایا۔ دوسری طرف ذی اقتدار افراد کے خود مختارانہ رویہ کو ختم کر کے انہیں داخلی قانون کا پابند بنا دیا۔

اس طرح ۱۹۲۸ء تک ایران نے بیرونی اور اندرونی طور پر خود مختاری حاصل کر لی۔

بلاشبہ شاہ کی طبیعت خود مذہب سے اس لئے اور بھی بددل ہو چکی تھی کہ علمار نے صحیح معنوں نے علم دوستی کا سبق نہیں دیا اور سیاست میں قدم رکھنے کے بعد ان کے اختلافات اس قدر وسیع ہو گئے تھے کہ جس خلیج کا پاٹنا ناممکن ہی معلوم ہو رہا تھا۔ قوم میں جہالت بدستور تھی اور ہر معمولی اور بے سواد شخص عمامہ اور عبا استعمال کرتا تھا جس کے نتیجہ میں عالم اور غیر عالم میں تمیز ناممکن تھی۔ گویا جہالت نے علم کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ لہذا ایک طرف تو اس نے عمامہ اور عبار پر پابندی عائد کردی اور دوسری طرف خود علمار پر جس قدر پابندیاں ہو سکتی تھیں، عائد کردیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ملک میں درویشوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو بھی ختم کردیا گیا۔ یہ لوگ صوفیہ ازم کا ظاہری لبادہ اوڑھ کر بھکشوؤں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، شاہ نے سختی کے ساتھ اس طرز زندگی کو بھی ختم کرنے کی ٹھان لی۔ جن لوگوں کا کام سوائے بھیک مانگنے کے اور کچھ نہیں تھا۔ ان پر سخت پابندی عائد کردی۔ شاہ مرحوم کے حکم سے عراق جانے پر پابندی عائد کردی گئی۔ اور ایک عرصہ دراز تک محدود تعداد میں افراد جایا کرتے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ علمار کے اثرات سے ایرانی قوم کو متاثر نہ ہونے دیا جائے۔

شاہ نے ایک اور قدم مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے اٹھایا کہ اپنی لڑکی کی شادی شاہِ مصر کے بیٹے سے کردی اور شاہِ مصر کی بیٹی سے اپنے اپنے بیٹے کی شادی کی۔

رفاہِ عامہ کے سلسلے میں ایک اہم کام یہ کیا گیا کہ اوقاف کا انتظام یکسر جند

لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ جس کے سبب وقف کا مطلب ہی ختم ہو گیا تھا۔ رضا شاہ مرحوم نے تمام اوقاف حکومت کے قبضے میں لے لئے اور ان کا استعمال صرف قومی مفاد کے لئے کیا گیا۔ یہ وہ قدم تھا جس کی طرف پاکستان میں تو صدر ایوب کے دورِ حکومت میں توجہ کی گئی اور موجودہ حکومت نے اِن اوقاف کا انتظام سنبھال لیا۔ جو کام وہاں تیس پینتیس سال قبل کیا گیا وہ اب یہاں اب شروع ہوا ہے (یہی واقعہ ثابت کرتا ہے کہ ایرانی ذہن کس قدر رسا ہے اور ان سے ہمیں سبق لینے کی ضرورت ہے)

البتہ ایک امر پردہ کا ختم کرنا ایسا دردناک واقعہ ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق پردہ بہرحال واجب ہے اور عوام نے بادشاہ کے اس فیصلہ کو بجبر ہی قبول کیا۔ چنانچہ آج بھی پردہ وہاں بدستور قائم ہے اور طبقۂ اعلیٰ کی خواتین کے علاوہ اس اسلامی حکم کا احترام اہلِ ایران کے دل سے عملاً نہیں گیا ہے۔

تعلیمی ترقی کے لئے سب سے بڑا اقدم ۱۹۳۵ء میں طہران یونیورسٹی کا قیام تھا۔ جو نہایت اعلیٰ اور منظم طور پر قائم کی گئی۔ صرف اس کی عمارتیں ہی پرشکوہ نہیں، بلکہ اس یونیورسٹی نے ایرانی ذہن کو بالکل بدل کے رکھ دیا۔ آج دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جہاں تعلیم مادری زبان میں نہ دی جاتی ہو (کاش! پاکستان کی بھی آنکھیں کھل جائیں اور وہ اس سے سبق لیتا) شروع شروع میں ہر سال ایک سو طلبا کو مغرب کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھیجا گیا اور حکومت کی طرف سے وہاں کے پروفیسروں سے اپیل کی گئی کہ وہ ملک کو ترقی

دینے میں ان طلبا کی مدد کریں۔ تاکہ یہ طلبا واپس آکر اہم کلیدی عہدوں پر کام کرسکیں چنانچہ حکومت کے اہم شعبوں میں فارغ التحصیل طلبا شامل کئے گئے اور یونیورسٹی کے لئے پروفیسروں کا انتخاب انہی میں سے کیا گیا۔ اسی دوران میں سینکڑوں اسکول اور کالج کھل گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۱ء تک تمام اسکول ملکی تحویل میں لے لئے گئے۔

نامور اہلِ علم اور دانشوروں کو خالص ادبی کام کرنے کی طرف لگادیا گیا۔ اور یونیورسٹی کے زیرِ ہدایت مختلف فنون کی کتابوں کے تراجم کئے گئے اور شائع کئے گئے۔

زبان کی وسعت اور ترقی کے لئے جو اقدامات کئے گئے، وہ بہت حد تک فکر انگیز تھے۔ فارسی زبان کو خالص بنانے کے لئے ایک اہم کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس نے بعض فیصلے ایسے کئے جس کے باعث اہلِ علم کئی گروہوں میں بٹ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ طہران یونیورسٹی ایک عظیم الشان تحریک تھی جس نے زبان کے مسئلہ کو ایک نئے انداز میں پیش کیا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو کلیتہً غیر زبان کے الفاظ فارسی سے نکالنے کے لئے کوشاں تھے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اس تحریک کے مخالفین میں سے تھے۔

ایک اور طبقہ تھا جو اِن دونوں کے بین بین کام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نتیجتاً وہ لوگ ہی کامیاب ہوئے جو غیر زبان (خصوصاً عربی الفاظ) نکالنے کے درپے تھے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ فرانسیسی زبان کے الفاظ نے عربی الفاظ کی جگہ لے لی۔ گویا مسئلہ جوں کا توں وہی رہا۔ فارس کا نام بدل کر

ایران کر دیا گیا۔ اس کا ایک نتیجہ نکلا کہ قدیم فارسی زبان کے الفاظ جو زبان میں پھر سے داخل ہو گئے (اب یہ مسئلہ کہ فرانسیسی الفاظ کس حد تک ایرانی زبان میں داخل ہو چکے ہیں، علیحدہ بحث چاہتا ہے)

اسی کے ساتھ ساتھ فارسی کی قدیم کتابوں کے مختلف نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں سے اکٹھا کئے گئے اور اس طرح ان کتابوں کو دوبارہ ایڈٹ کر کے شائع کیا گیا۔ علامہ قزوینی مرحوم اس سلسلے میں سالہا سال تک اس کام میں لگے رہے اور نئے سرے سے کئی کتابوں کو ایڈٹ کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔

یہ ضرور ہے کہ شاہ نے اہل علم افراد کے لئے سیاست میں پابندی لگا دی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ صاحبانِ علم اپنے کام میں پوری توجہ کے ساتھ مشغول رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ علم حضرات نے پوری تندہی اور دلچسپی سے علمی کاموں میں حصہ لیا اور سیاست کے بکھیڑوں سے علیحدہ ہو کر خالص علمی زندگی بسر کی۔ جس کی بین مثال علامہ دہخدا کی لغت کی کتاب ہے جو سو جلدوں میں مرتب کی گئی ہے۔

جنگ عظیم دوم کے منحوس سایہ نے ایران پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ ایران اپنی امن پسندی کے سبب ان جھگڑوں سے علیحدہ رہنا چاہتا تھا۔ لیکن بہرحال شاہ مرحوم کی پوری ہمدردیاں جرمنی کے ساتھ تھیں اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکا گیا۔ اور اس دوران میں کئی ایرانی کمیونزم پر وپیگنڈے کے جرم میں پکڑے گئے، جن کو طویل سزائیں دی گئیں۔ اتحادی سامانِ جنگ

ایران کے ذریعہ روس بھی پہنچانا چاہتے تھے۔ اس لئے اپنے مفادات کے لئے انہوں نے ایران پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی۔ شاہ مرحوم کی پالیسی کے خلاف یہ امر تھا کہ اغیار ایرانی سرزمین پر قبضہ کرلیں اور اس کی دولت (تیل) سے بھی فائدہ اٹھائیں۔ لیکن روس و برطانیہ دونوں نے بیک وقت حملہ کرکے ایران کو مجبور کردیا کہ وہ راستہ بھی دے اور اس کے تیل سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔ شاہ کو ان سنگین حالات کے تحت ہمیشہ کے لئے اپنے ملک کو خیرباد کہنا پڑا اور اپنے بڑے بیٹے موجودہ شاہنشاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کے حق میں دست بردار ہوگئے۔

رضا شاہ نے جولائی ۴۴ء میں جوہنسبرگ (جنوبی افریقہ) میں اپنے آخری دن گذار کر وہیں وفات پائی۔ ۵۰ء میں ان کی میت ایران لاکر عظیم الشان مقبرہ میں دفن کردی گئی اور ان کی عظیم خدمات کے پیش نظر انھیں رضا شاہ کبیر کے نام سے یاد کیا گیا۔

باب دہم

اعلیحضرت ہمایونی محمد رضا شاہ پہلوی

شاہنشاہ ایران کی ۴۵ سالہ زندگی اور ۲۳ سالہ دورِ سلطنت کا جائزہ

موجودہ شاہنشاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء میں طہران میں پیدا ہوئے۔ ایران کی ۲۵۰۰ سالہ شاہنشاہی کے وارثِ تخت و تاج نے سلطنت کی باگ ڈور ایسے نازک موقع پر سنبھالی جبکہ مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک میں بدامنی اور انقلابات کا دور دورہ تھا۔ اس وقت اس منطقے کی مثال ایک طوفانی سمندر کی سی تھی، جہاں امواج حوادث کے تھپیڑے ہر روز حکومتوں کو غرق اور نئی حکومتوں کو جنم دے رہے تھے۔ شاہ نے اس متلاطم سمندر کے گرداب سے اپنے ملک کی کشتی کو بچا کر سلامتی کے ساحل تک پہنچا دیا ملک میں سیاسی ثبات اور امن و عافیت کو برقرار کیا اور جب اس طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا تو ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔

گذشتہ ۲۳ سالہ عہدِ حکومت میں شاہ کو بے شمار مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بیرونی عناصر اندرونی سازشوں نے ملکی آزادی اور سالمیت

کو خطرے میں ڈال دیا۔ لیکن بہادر شاہ کے قدم نہیں لڑکھڑائے اور انہوں نے نہایت حوصلہ مندی اور شجاعت و شہامت سے کام لے کر ملک کو انتشار وا... سے بچا لیا۔ شاہ کے اس جذبۂ حب الوطنی، ایثار اور خلوص نیت نے عوام کے دل موہ لیے اور وہ بیش از بیش شاہ کے شیدائی بن گئے۔ چنانچہ آج بھی جو سیاح ایران میں آتے ہیں اور وہ حالات کا بنظرِ تعمق مطالعہ کرتے ہیں، ان کو یہ کہنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہوتا کہ شاہ کی سلطنت کی جڑیں عوام کے قلوب میں جم گئی ہیں۔

شاہِ ایران جو آج اپنی عمر کے ۴۶ ویں منزل میں قدم رکھ رہے ہیں جب ۱۲ سال کے ہوئے تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سوئٹزرلینڈ تشریف لے گئے اور ۱۷ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر واپس تہران آ گئے اور یہاں دو سال تک فوجی کالج میں تربیت حاصل کی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اور اس پر باپ کی نگرانی اور توجہ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ نوجوان ولیعہد کو فوج کا انسپکٹر کا عہدہ دیدیا گیا۔ ولیعہدی ہی کے زمانہ میں آپ نے شاہ فاروق والیٔ مصر کی ہمشیرہ شاہزادی فوزیہ سے شادی کر لی۔ جن کے بطن سے شاہزادی شہناز تولد ہوئیں، جو عمر کی ۲۴ بہاریں دیکھ چکی ہیں۔

شاہنشاہ کے ۲۳ سالہ عہدِ حکومت کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے بارہ سال تو طوائف الملوکی اور اندرونی ہرج و مرج کو دور کرنے، بیرونی اور اندرونی خطرات کو رفع کرنے اور امن و امنیت آزادی، سالمیت اور وحدت ملی کو برقرار کرنے میں لگ گئے۔ شاہنشاہ کی سلطنت کا دوسرا

اصلاحی دور ہے جس میں اقتصادی بحالی، تعمیری کام اور تولیدی عملیات شامل ہیں۔

جب شاہ نے عنانِ حکومت سنبھالی ہے، تو تمام دنیا جنگ کی آگ میں جل رہی تھی۔ ایران کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالت دگرگوں تھی۔ بیرونی طاقتوں نے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کردیا۔ خارجی افواج مقیم ایران نے مزید پنجے نکالنے شروع کر دیئے اور کھلم کھلا اور جا بیجا اپنے ایجنٹوں اور گرگوں کی حمایت کرنے لگیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ آذر بائیجان کا واقعہ رونما ہوا۔ یہ کیا دھرا سرخ فوج کا تھا۔ بہرحال شاہ کی دور رس نظری، سیاست فہمی، شجاعت اور دانائی کی وجہ سے آذر بائیجان آزاد ہوکر دوبارہ سلطنتِ ایران میں شامل ہوگیا۔ یہ شاہ کی عظیم فتح تھی۔

اس کے فوراً البعد ہی تیل کا قضیہ کھڑا ہوگیا۔ خارجی طاقتوں نے ملک کے غداروں کے ساتھ مل کر اور اقتصادی کمزوری اور حکومتِ وقت کی نااہلیت سے فائدہ اٹھا کر شاہ کے خلاف بغاوت پھیلادی۔ اس نازک موقع پر شاہ نے دانائی سے کام لیا اور عارضی طور پر ملک سے باہر تشریف لے گئے۔ شاہ کی عدم موجودگی میں عوام کو حکومتِ وقت اور اربابِ حکومت کی نیت کا پتہ چل گیا چنانچہ عوام نے مجموعی طور پر شاہ کی واپسی اور حکومت وقت کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ مصدق کی حکومت نے ان کو دبانے کی کوشش کی اور طہران کے بازاروں اور گلی کوچوں میں بہتے بیگناہوں اور معصوم زن و بچوں کے خون کی ندیاں بہادیں

لیکن شمشیر کا کھیت کبھی سر سبز ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ آخر کار شہیدوں کا خون رنگ لایا اور انہی نہتے لوگوں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ۲۸ مرداد کو شاہنشاہ واپس تشریف لائے اور عوام نے نہایت خلوص اور تپاک سے اپنے محبوب کا خیر مقدم کیا۔ عوام کے ایثار و قربانی کا گہرا اثر شاہ کے دل پر پڑا۔

شاہنشاہ کی سلطنت کا دوسرا دور ایران کا ایک تعمیراتی دور ہے۔ جس کو ایران کے سیاسی ثبات اور امن و امنیت کے قیام کا دور کہا جا سکتا ہے۔ شاہ کا سب سے پہلا قدم اقتصادی بحران کو ختم کرنا تھا۔ ایرانی تیل کو قومی ملکیت قرار دینے کے بعد ملک کی آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ مالی حالت رو بہ ترقی ہو گئی۔ بڑے بڑے سد تعمیر کئے گئے۔ سڑکیں اور شاہراہیں بنائی گئیں اور ان پر تار کول بچھا دیا گیا۔ ملک میں ریلوں کا جال بچھا دیا گیا۔ جہالت اور بے علمی کے خلاف مہم جاری کی گئی۔ ابتدائی اور اعلیٰ مدارس کی تعداد تین گنا ہو گئی۔ نئی یونیورسٹیوں اور نئے کالجوں کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ملک بھر میں متعدی امراض مثلاً دق، سل اور ملیریا کی بیخ کنی کی گئی۔ چھوٹے اور بڑے پندرہ ہزار کارخانے کھولے گئے۔ جن میں لوہا پگھلانے اور ڈھالنے کے کارخانے بھی شامل ہیں۔ ملک میں صنعت کو فروغ دیا گیا اور زراعت کے لئے جدید ترین طریقے استعمال کئے جانے لگے۔

ملک میں حقیقی ڈیموکریسی رائج کرنے کی نیت سے شاہ نے ایک چھ نکاتی اصلاحی پروگرام جاری کیا جو عرفِ عام میں "شاہ اور مردم کے سفید انقلاب" کا منشور کہلاتا ہے۔ ۶ بہمن ۱۳۴۱ کو ایک آزاد اور غیر جانبدار ریفرنڈم میں قوم نے تقریباً متفقہ طور پر ان اصلاحات کے حق میں رائے دی۔

اصلاحی پروگرام کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

(۱) اصلاحاتِ ارضی :۔ اس قانون کی رو سے ایک کسان کو اس زمین کا جس کو وہ بوتا اور جوتتا ہے، مالک قرار دیا گیا اور اس طرح " زمیندار رعیت کا نظام " ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔

(۲) جنگلات کو قومی ملکیت قرار دید یا گیا۔

(۳) سرکاری کارخانوں کے حصص کو فروخت کیا گیا اور وصول شدہ آمدنی سے اصلاحاتِ ارضی کے اجراء کے لئے سرمایہ فراہم کیا گیا۔

(۴) صنعتی اور تولیدی کارخانوں کے منفع میں مزدوروں اور کاریگروں کو حصہ دار مقرر کر دیا گیا۔

(۵) قانونِ انتخاب میں اصلاح کی گئی۔

(٦) تعلیمی سپاہ کا قیام عمل میں آیا۔

ان اصلاحات کے علاوہ شاہنشاہ کے حکم سے " سپاہِ صحت " قائم ہوئی اور مندرجہ بالا پروگرام میں ساتویں مادہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ ان اصلاحات میں ابھی ایک اور باب کا اضافہ ہونے والا ہے جو " سپاہ عمران و توسعہ " کے نام سے موسوم ہوگا۔

شاہنشاہ کی جاری کردہ اصلاحات سے سب سے زیادہ فائدہ دیہات اور دیہاتیوں کو پہنچا ہے۔ کسان اب چھوٹی چھوٹی زمینوں کے مالک بن گئے ہیں تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت نے ان میں استقلال اور سوچ بچار کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ اور اب وہ انتخابات میں حصہ لے کر اپنے مستقبل کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایرانی جمہوری نظام کی ابتدا گاؤں سے

ہوتی ہے۔

ایران میں جو انقلابات آئے یا جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کے علمبردار خود شاہنشاہ ہیں جنہوں نے نہ مخالفتوں کی پرواہ کی نہ مخاصمتوں کی۔ بلکہ ہر سازش اور ہر تخریبی کارروائی کو دستِ آہنی سے کچل کر رکھ دیا۔ یہ شاہنشاہ کی اولوالعزمی کی دلیل ہے۔

"قانونِ ارضی کے نفاذ سے لے کر اب تک ایران میں دس ہزار گاؤں کسانوں میں تقسیم ہو چکے ہیں اور ابھی مزید دیہات تقسیم کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں اصلاحات ارضی کا یہ تجربہ جس کی پشت پر تعاونی انجمنیں ہیں جن کو حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے، بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔

ایرانی مجلس سنا کا افتتاح کرتے ہوئے شاہنشاہ نے امید ظاہر کی کہ ایران بہت جلد ایک صنعتی ملک بن جائے گا اور جس وقت صنائع کو فروغ ہوگا تو ملک کی ۷۵ فیصدی آبادی جو فی الحال زراعت میں مشغول ہے، صنعتی اداروں اور کارخانوں میں کام کر کے اپنی روزی کما سکے گی۔ اور کسانوں کی تھوڑی سی تعداد مشینوں کے ذریعہ کاشتکاری کے لئے کافی ہو گی۔ ان اصلاحات نے شاہنشاہ کو اور زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ اور خاص طور پر کسانوں اور مزدوروں کے حلقوں میں کیونکہ اصلاحات سے سب سے زیادہ فائدہ انہی دو طبقوں کو پہنچا ہے۔ عوام کی انفرادی آمدنی اور معیار زندگی کافی بلند ہو گیا ہے۔ اور ایران آج شاہنشاہِ معظم کی قیادت میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔

آذر ماہ ۱۳۳۸ میں شاہنشاہ نے دوشیزہ فرح دیبا سے جن کا تعلق ایران کے ایک قدیم اور نجیب خاندان سے ہے، شادی کی اور گیارہ مہینے بعد ۳۱ر اکتوبر کو شہبانو کے بطن سے ایران کے تاج و تخت کے وارث شاہزادہ رضا پہلوی نے جنم لیا۔ ولیعہد ایران کی ولادت پر ایران ہی نہیں بلکہ تمام دنیا میں خوشیاں منائی گئیں۔ کچھ عرصہ بعد شاہزادی فرحناز نے عرصۂ حیات میں قدم رکھا۔

آبانماہ کی چار تاریخ (۲۶ر اکتوبر) کو ہر سال ایران کے طول و عرض میں شاہنشاہ کی سالگرہ بڑی آب و تاب سے منائی جاتی ہے۔ جگہ جگہ جلسے منعقد ہوتے ہیں جن میں شاہنشاہ کی کارگذاریوں کو سراہا جاتا ہے اور مساجد اور معابد میں شاہنشاہ کی صحت و سلامتی اور طول عمر کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

(ماخذ:۔ یوم پیدائش نمبر شاہنشاہ ایران۔ سفارت کبریٰ ایران و پاکستان)

شہنشاہ نے اپنی بے شمار اعلیٰ صلاحیتوں اور اعلیٰ اصلاحی تدبیروں کے سبب نہ صرف اپنے ملک سے بلکہ دوسرے ممالک سے بھی جو خراج تحسین لیا ہے۔ اس نے مغربی ممالک کا یہ غلط پروپیگنڈا ختم کر دیا ہے کہ مشرق میں بادشاہوں کا کام صرف عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا ہے اور یہ کہ انھیں مغربی علوم و فنون کا قطعی علم نہیں ہوتا یا ان میں بحیثیت سربراہ اعلیٰ ہونے کے وہ صلاحیتیں نہیں ہوتی ہیں جن کے سبب وہ اپنے ملک کی مشکلات پر غالب آسکیں اور اپنے ملک کو ترقی یافتہ ممالک کی صفوں میں کھڑا کر سکیں۔ اس کا ثبوت وہ انٹرویو ہے جو شاہنشاہ نے حالیہ دورۂ یورپ کے سلسلہ میں ایک اخباری نمائندے کو دیا اور جس کی تفصیل حسب ذیل ہے

ف روزنامہ "جنگ" ۱۲ر مارچ ۱۹۶۵ء

شہنشاہ ایران حال ہی میں لندن پہنچے تو وہاں ایرانی سفیر کی قیام گاہ پر ایک روزنامے کے نمائندے نے ان سے خصوصی انٹرویو لیا۔ اس ملاقات کی جو روداد شائع ہوئی ہے اس میں اخباری نمائندے نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شاہ محمد رضا شاہ پہلوی بہر حال اور بہر لباس میں واقعی ایک متین اور باوقار شہنشاہ دکھائی دیتے ہیں۔ مگر جب وہ ایران کی معاشی حالت پر بے پناہ اور بے شمار تاریخی اسباب و علل، اصلاحی تدابیر، معاشی، صنعتی، زرعی اور تعلیمی امور پر ایک ماہر کی طرح باتیں کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ دنیا میں ایک بادشاہ ایسا بھی ہے جس کی علوم جدیدہ آج کے معاشرتی اور اقتصادی مسائل اور ان سے پیدا ہونے والے حالات و واقعات پر اتنی گہری نظر ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کی باتیں روایتی بادشاہوں سے کبھی منسوب نہیں ہوئیں۔ بہر حال شہنشاہ ایران سے اخباری نمائندے کے اس انٹرویو کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

شہنشاہ انگریزی میں بڑی فصاحت اور روانی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ معاشیات پر ان کی معلومات وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ہیرالڈ ولسن (لیبر) سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی زبان سے زرعی امدادِ باہمی کی انجمنوں، افراطِ زر کی روک تھام کرنے کے لیے سپر مارکیٹوں کے قیام، جنگلات کو قومی تحویل میں لینے اور اجارہ داریاں ختم کرنے کی باتیں سن کر کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بادشاہ سے باتیں کر رہا ہے۔ شاہ نے کہا یوں تو سارا مشرقِ وسطیٰ ہی غربت زدہ ہے لیکن میں اپنے ملک کے مسائل کی بات کروں گا۔ میں نے ایران سے غربت و جہالت ختم کر دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ہم یہ کام کر سکتے ہیں۔ اس قوم میں جان ہے

انسانی دولت ہے، جو قدرتی دولت کے وسائل سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور پھر ہمارے ہاں قدرتی وسائل کی بھی کوئی کمی نہیں۔ جب میں نے سوال کیا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ ایران میں عوامی سطح کی بجائے شاہی سطح سے انقلاب برپا کیا جا رہا ہے تو انہوں نے اس سے اتفاق کا اظہار کیا اور کہنے لگے۔ انقلاب کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ انصاف کو بروئے کار لایا جائے۔ آئندہ پیش آنیوالے حالات کو پہلے سے بھانپ لیا جائے۔ وقت اور زمانے کے ساتھ چلا جائے اور اگر زمانے سے ایک دو قدم آگے رہا جائے تو اور بھی بہتر ہے۔ کیونکہ جب آپ مستقبل کی تیاریاں کر لیتے ہیں تو پھر کسی ہنگامی حالت میں آپ کو کوئی وقتی اور نیم دلانہ کارروائی نہیں کرنی پڑتی۔ ایک سوال کے جواب میں شہنشاہ نے کہا کہ اس ملک میں جب بھی اچھے بادشاہ برسرِ اقتدار آئے تو ملک نے خوب ترقی کی اور جب بادشاہ ناکارہ ملے تو ملک پر حملے ہوئے، ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑا، ہماری تحقیر ہوئی مگر میں اس صورتِ حال کا ازالہ چاہتا ہوں میری تمنا ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی کا دار و مدار کسی ایک شخصیت پر نہ رہے۔ ہم قومی سماجی اور معیشت کو اس طرح منظم کرنا چاہتے ہیں کہ ملک کا سربراہ کوئی ہو، امورِ مملکت اطمینان کے ساتھ طے پاتے رہیں۔

جب بادشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی کہ اُن کے انقلاب کے نتیجہ میں کیا ان کی بادشاہت اور ان کے خاندان کی حکومت ختم نہیں ہو جائے گی؟ تو انہوں نے کہا اس کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بادشاہت میرے لئے کوئی عیش و آرام کا ذریعہ ہے، یہ تو کانٹوں کا بستر ہے۔ کانٹوں کا تاج ہے۔

بادشاہت میں دردِ سر کے سوا بعض اوقات اور کچھ نہیں ملتا۔ غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جن ملکوں میں بادشاہت ہے وہاں زیادہ استحکام ہوتا ہے۔ روز روز کے ہنگامے نہیں ہوتے۔ شاہ سے کہا گیا کہ اگر کوئی ان پر یہ الزام لگائے کہ انہوں نے اصلاحات محض اپنی بادشاہت کو برقرار رکھنے کے لئے نافذ کی ہیں تو آپ نے کہا کہ۔ اس میں کیا حرج ہے۔ اگر یہ الزام لگایا بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر بادشاہت سے ملک کی خدمت ہو سکتی ہے تو اس میں کیا خرابی کی بات ہے؟

شاہ نے کہا۔ مجھے بادشاہت سے کیا ملا؟ میں اپنی تمام ذاتی دولت یا کم از کم ۹۰ فیصد جائداد عوام میں تقسیم کر چکا ہوں۔ یہ میں نے کیوں کیا؟ دولت سمیٹنے کے لئے تو ہرگز نہیں۔ میں روزانہ اوسطاً سولہ گھنٹے کام کرتا ہوں۔ کیوں؟ کس کے لئے؟ اپنے ملک کی خاطر۔ اس کی فلاح و بہبود کے لئے۔ میں اپنے ملک کی خدمت کرتا ہوں۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ شاہ سے سوال کیا گیا کہ اگر مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے بادشاہ بھی ان کے نقشِ قدم پر چلیں تو کیا ان کے خیال میں یہ بہتر نہ ہوگا۔ شہنشاہِ ایران نے کہا میں تو صرف اپنی اور اپنے ملک کی بات کروں گا۔ ایران ایک قدیم ترین ملک ہے۔ یہاں ہمیشہ سے بادشاہت چلی آرہی ہے۔ ہم پر کسی غیر ملکی طاقت نے بادشاہت مسلط نہیں کی تھی۔ یہ تو اس ملک کے رگ و پے میں ہے۔ خون میں رچی بسی ہوئی ہے۔

شہنشاہ نے کہا کہ ایرانی بادشاہ کے وقار کا دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کے وقار سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں نے

کبھی اپنی ذات کو سامنے رکھ کر کچھ نہیں سوچا۔ کامیابی کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی ذات کو بھول کر اپنے ملک کے مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے۔

جب میں نے شاہ سے کھلنڈرے اور عیاش بادشاہوں کے بارے میں سوال کیا تو شاہ اپنے ہی آپ سے بڑبڑاتے ہوئے بات کرنے لگے: "کھلنڈرے۔ کھلنڈرے۔ کیا کہا؟ عیاش! ہاں سابق شاہ فاروق کو کہہ لو۔ مگر یاد رکھو۔ حال میں ہی ایسے بادشاہ موت کے گھاٹ اتارے گئے ہیں جو بیچارے بے حد معصوم تھے"

دوسرے سوالوں کے جواب میں شاہ ایران نے کہا۔ ٹیکسوں کی وصولی کا طریقہ ہمارا ایک اہم مسئلہ ہے اور میں آجکل برٹش سسٹم کا مطالعہ کر رہا ہوں تاکہ ہم اپنے ملک میں ٹیکس وصول کرنے کا کوئی مؤثر نظام نافذ کرسکیں۔ ہم لوگوں کو باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرنے کی عادت ڈالنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ترقی ناممکن ہے شہنشاہ نے کہا کہ ایرانی نظم ونسق کی اعلیٰ ترین سطح پر زبردست تطہیر کے بعد رشوت اور بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ممکن ہے نچلی اور درمیانی سطح پر کچھ لوگ رشوت خور ہوں بہرحال ہم ان سے بھی نمٹ لیں گے۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ ایران میں بھی رشوت اسی قدر ہے جتنی کہ بعض دوسرے ملکوں میں ہے۔

شہری آزادیوں کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شہنشاہ نے کہا کہ آپ کو اس بات پر اعتراض ہے کہ حکومت پر نکتہ چینی کی پاداش میں لوگوں کو قید کیوں کیا جاتا ہے۔ مگر ایسی آزادی تحریر و تقریر سے کیا فائدہ جس کے باوجود آپ گداگروں کی طرح غربت و افلاس کی زندگی گذاریں اور زمینداروں کے غلام بن کر رہیں۔ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی آمدنیاں بڑھیں اور انکا

معیارِ زندگی بلند ہو۔

ذاتی اور نجی باتوں کے دوران شہنشاہ نے کہا کہ یہ ڈاکٹر بھی عجیب لوگ ہیں ہروقت مشورہ دیتے رہتے ہیں، زیادہ کام نہ کرو۔ آپ بہت کام کرتے ہیں کہتے ہیں ایک دو روز پوری چھٹی مناؤ۔ ہر سال ایک دو ماہ کے لئے سمندر پار جاکر سیر، تفریح کرتے رہا کرو وغیرہ وغیرہ۔ مگر مسلسل محنت و مشقت کے بعد خدا کا شکر ہے کہ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے سوال کیا "کیا ملکہ فرح سے ۵۹ء میں شادی کے بعد آپ اپنی زندگی کی مسرتوں میں کوئی اضافہ محسوس کرتے ہیں؟ شہنشاہ نے کہا۔ کیوں نہیں۔ شادی سے انسان کیا حاصل کرنا چاہتا ہے محبت گھربار کا احساس۔ ایک ساتھی، جو آپ کے دکھ درد اور مسرتوں میں شریک ہو اور اہل وعیال سکون قلبی اور طمانیت کا باعث نہیں۔ میری شادی شدہ بیٹی ننھا بیٹا اور بیٹی۔ یہ میرے بچے میری متاعِ حیات ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے میرے بچے بھی آگے چل کر مجھ سے اسی قدر محبت کرینگے۔

عالمِ اسلام سے محبت

شہنشاہ کو جس قدر محبت اپنے ملک سے ہے اسی قدر اپنے ہمسایہ ممالک سے بھی۔ خصوصاً پاکستان کے لئے آپ کی بے پایاں محبت کا ثبوت افغانستان و پاکستان میں دوبارہ سفارتی تعلق کی استواری کے لئے کامیاب جدوجہد ہے۔ جس کے باعث افغانستان و پاکستان دونوں کی گتھیوں کو سلجھا دیا گیا۔ اور اس طرح اب دونوں ممالک باہمی تعاون اور اتحاد کے جذبے کے تحت اپنے اقتصادی اور تجارتی تعلقات کو نئے سرے سے مستحکم کر رہے ہیں۔

ایک اور انقلابی معاہدہ ایران۔ پاکستان اور ترکی کے درمیان (R.C.D.) علاقائی تعاون کے معاہدہ کا اجراء ہے۔ جس کے سبب یہ تینوں ممالک اپنے تجارتی۔ معاشی اور معاشرتی تعلقات کی موجودہ معاہدہ کی روشنی میں تجدید کر رہے ہیں۔ یہ اصلاحاتی نظام پاکستان کو ایران سے قریب لا رہا ہے۔ اس طرح یہ ایک سلسلہ عالم اسلام کی ایک حد کو دوسرے سے ملاتا ہے۔

شہنشاہِ ایران اور صدر پاکستان نے اس موقع پر جن خیالات کا اظہار کیا۔ وہ حقیقتاً اُس خواب کی تعبیر ہے جو اقبال مرحوم نے دیکھا تھا۔ ؏

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

حرفِ آخر

اوائل ستمبر میں بھارت نے پاکستان پر اچانک حملہ کر دیا۔ ہندوستان کے جارحانہ حملے کے خلاف ملتِ پاکستان کی حمایت و رفاقت کا جو عملی ثبوت شہنشاہِ ایران اور ملتِ ایران نے دیا اس کے لئے ہمارا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے اور ان کی عملی ہمدردیوں کے سبب ہماری مشکلات ہمارے لئے کم ہو گئیں۔ شہنشاہِ ایران کی ملت پاکستان کے ساتھ بے پایاں محبت ہی کا اثر تھا کہ جب صدر ایوب امن مشن پر غیر ملکی دورے پر جاتے ہوئے تہران ٹھہرے اور انہوں نے شہنشاہ موصوف کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے فرمایا کہ۔

"یہ تو ہمارا فرض تھا۔"

چنانچہ ۲۶ر اکتوبر کو شہنشاہ کی سالگرہ کے موقع پر فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خاں نے ایک پیغامِ تہنیت بھیجا تو انہوں نے اس امر کا اعادہ

کیا کہ دشمن کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ کرنے کے لئے ایران کی مکمل حمایت ہمارے لئے طاقت وقوت کا سرچشمہ ہے۔

اسی طرح ایرانی پریس نے بھارتی جارحیت کی مذمت میں پاکستان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ شہنشاہِ ایران نے جس قدر واضح انداز میں کشمیر کے مظلوم انسانوں کی حمایت کی، وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔ عالم تاریخ میں شہنشاہ کا دورِ حکومت تاریخ کا سنہری باب ہوگا۔

ہم شہنشاہ کی سلامتی صحت، درازیٔ عمر اور ملّتِ ایران کی ترقی کے لئے خداوند عالم کی درگاہ میں دعا کرتے ہیں۔

ع۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں ۔ آمین باد

مآخذ

(الف) فارسی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	مقام طباعت	سن طباعت
۱	ایران باستانی	حسن پیر نیا مشیر الدولہ	طہران	۱۹۲۷
۲	تاریخ انقلاب ایران	پروفیسر براؤن ترجمہ احمد پژوہ	"	۱۹۵۰
۳	تاریخ انقلاب مشروطیت ایران (ہفت جلد)	دکتر مہدی ملک زادہ	"	۱۹۴۹ تا ۱۹۵۵
۴	تاریخ ایران	عبداللہ رازی	"	۱۹۳۸ء
۵	تاریخ ایران قدیم	ڈاکٹر غلام سرور	کراچی	۱۹۵۲ء
۶	تاریخ بیداری ایران (جلد اوّل دوم)	ناظم الاسلام کرمانی	طہران	
۷	تاریخ بیداری ایران	حبیب اللہ مختاری	"	۱۹۳۷
۸	تاریخ جرائد جلد چہارم	محمد صدر ہاشمی	اصفہان	۱۹۴۸
۹	تاریخ مختصر احزاب سیاسی	ملک الشعراء بہار	طہران	۱۹۴۷
۱۰	تاریخ مشروطہ ایران سنہ بخش	سید احمد کسروی تبریزی	طہران	۱۹۵۰

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	مقام طباعت	سن طباعت
۱۱	تاریخ معاصر	حیات یحییٰ	طہران	۱۹۴۸
۱۲	تجلیات روح ایرانی	حسین کاظم زادہ ایرانشہر	برلن	۱۹۲۳
۱۳	فغان ایران	(مسٹر شوسٹر) ترجمہ امام الاعظم بلگرامی	حیدرآباد	۱۹۱۳
۱۴	قرارداد روس و انگلینڈ ایران	وحید مازندرانی	طہران	۱۹۴۹
۱۵	محمد علی میرزا و حکومت تزار	ترجمہ شرف قہرمانی	،،	۱۹۳۰
۱۶	مردان خود ساختہ	خواجہ نوری		۱۹۵۶

(ب) انگریزی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	مقام طباعت	سن طباعت
۱۷	انسائیکلوپیڈیا آف برٹینکا			
۱۸	ایران			
۱۹	جدید ایران	پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم ایم اے، پی ایچ ڈی		

(ج) جرائد

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	مقام طباعت	سن طباعت
۲۰	روزنامہ جنگ	کراچی		
۲۱	اطلاعات ایران	سفارت خانہ ایران		

ایک ضروری التماس

جو اصحاب اِس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ انکی خدمت میں
درخواست ہے کہ وہ ہمیں ازراہِ کرم اپنا نام اور ڈاک کا مکمل
پتہ لکھ بھیجیں تاکہ ہمارے ہاں سے اُردو علم و ادب کی جو نہایت
مُفید کتابیں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی ہیں۔ اُن کی اِطلاع
اور دیگر مطبوعات کی فہرست ہم اُن کی خدمت میں روانہ کرتے
ہا کریں۔ اُمید ہے کہ ہمارے معزّز بھائی اور بہنیں ہماری اِس
خواست کو شرفِ قبول بخش کر نہ صرف اپنا پتہ بلکہ اپنے
یزوں اور رشتہ داروں کے نام و پتے بھی ہمیں بھیجکر ممنون فرمائینگی۔

(شیخ) عنایت اللہ منیجنگ ایجنٹ تاج کمپنی لمیٹڈ
قرآن منزل۔ ریلوے روڈ لاہور